ایک گلاب

رفعت سراج

فہرست

-1	بچہ	9
-2	چاند اور گہن	17
-3	گھر اور گھروندہ	30
-4	برسرِ روزگار عورت	43
-5	عید کا جوڑا	76
-6	ہماری اماں	106
-7	ایک گلاب	117
-8	مرجینا	134
-9	زوگی	149
-10	شکستِ شب	166

بچہ

گھر میں شادی کا ہنگامہ تھا۔ ملک کے تقریباً ہر شہر سے آئے ہوئے مہمان بھرے ہوئے تھے۔ اس گھر میں آئے دن یہ ہنگامے اترتے رہتے تھے۔ خیر سے چھ بیٹے تھے۔ عبدالصمد کے اس بار تیسرے بیٹے کی شادی تھی۔ لڑکیوں کے جتھے شادی بیاہ کے گیت الاپتے رہتے تھے۔ ان کے کھنکتے قہقہے صحیح معنوں میں گھر کی اصل رونق تھے۔ پڑوس کی شوخ اور شرارتی لڑکی نیلے رنگ کے کپڑوں میں جادو جگا رہی تھی۔ ننھے میاں کب سے ایک کونے میں بیٹھے اسے دیکھے جا رہے تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا وہ کئی بار اپنی منمنائی آواز میں چائے کے لیے کہہ چکے تھے مگر کوئی توجہ ہی نہیں دے رہا تھا۔ اس بے توجہی پر ان کے آنسو دل پر ٹپکنے لگے تھے۔

''بھابی جان ہم اتنی دیر سے چائے کے لیے کہہ رہے ہیں مگر.....'' انھوں نے پاس سے گزرتی سب سے بڑی حسین بھابی سے فریاد کی۔

''مل جائے گی بھئی چائے بھی کہیں ڈیوٹی پر جانا ہے تمھیں صبر کرو'' وہ بے زاری سے کہہ کر آگے بڑھ گئیں۔

''ارے ننھے میاں چائے کی کیا بات ہے ابھی لائے دیتی ہوں'' وہی نیلے کپڑوں والی پڑوسن لڑکی رخشندہ نرمی سے بولی اور ٹرے سے چائے کا کپ اٹھانے چل دی۔

''لو بھئی تم بھی چائے پیو۔'' وہ کپ ان کے ہاتھ میں تھما کر شگفتگی سے گویا ہوئی۔

ننھے میاں نے اتنی بے صبری سے کپ ہونٹوں سے لگا لیا جیسے پہلی مرتبہ چائے پی رہے ہوں۔

''ارے بھئی لڑکیو، چار بجے تک تیار ہو جانا۔ دور کا معاملہ ہے برات پہنچتے پہنچتے ہی پہنچے گی۔'' امی جان نے لڑکیوں کو یاد دہانی کرائی کہ انھی کی تیاریوں سے خطرہ تھا۔ عین

وقت پر کسی کا میچنگ پراندہ گم ہو جاتا کسی کا دوپٹہ۔

''امی جان ہم بھی برات میں جائیں گے۔'' ننھے میاں نے ماں کا آنچل تھام کر مدعا بیان کیا۔

''ارے نہیں تم کیا کرو گے جا کر؟ خواہ مخواہ ہی پریشان ہو گے۔ دادی اماں کے پاس ہی رہنا تم۔''

''سب لوگ تو جا رہے ہیں۔'' انھوں نے افسردگی سے کہا۔

''بس ایک مرتبہ کی بات سن لیا کرو۔'' وہ تلخ ہو گئیں۔

''اور وہ جو آپ نے ہمارے لیے برات کے دن کا جوڑا سلوایا ہے۔'' انھوں نے ماں کو عہد شکن کہنا چاہا۔

''جوڑا پہن لینا۔ سہرے بندی میں شریک ہو جانا۔'' وہ آگے بڑھ گئیں۔ ''اچھے خاصے سمجھدار ہو مگر حرکتیں چھوٹے بچوں کی طرح ہیں۔'' ان کی بڑبڑاہٹ ننھے میاں نے بخوبی سن لی۔

برات جانے کے بعد گھر ایک دم سنسان سا ہو گیا تھا۔ بچی کھچی عورتیں گھر کو سنوارنے میں لگ گئی تھیں۔ کہیں کپڑے پڑے تھے، کہیں خوشبوئیں اور پھولوں کی پتیاں۔ سارا گھر گویا بکھرا پڑا تھا۔ گھر کی صفائی ستھرائی کے بعد عورتیں دادی اماں کے پاس سر جوڑ کر بیٹھ گئیں۔ ننھے میاں لوہے کی کرسی پر بیٹھے سوچوں میں غرق تھے۔

''اے چچی جان، اسے دیکھ کر افسوس ہی ہوتا ہے بے چارے کا کیا ہوگا؟''

''دیکھ لو، بیس برس کا ہو گیا ہے۔ میری ساجدہ کی عمر کا ہے۔''

''خدا معلوم کیوں ستم ٹوٹا اس کی جان پر؟ کون سے گناہوں کا بھگتان ہے ہمارے۔'' دادی جان کی آواز میں آزردگی سما گئی۔

''دھیان رکھا کریں اس کا، میں تو جب سے آئی ہوں، دیکھ رہی ہوں کسی کو پروا نہیں ہے اس کی۔''

''خیر یوں تو نہ کہو سب خیال رکھتے ہیں۔ اب اس کی تو عادت ٹھہری بات بات پر اڑنے کی۔'' دادی اماں نے برا مان کر رشتے کی بہو کو جواب دیا۔

''میرا مطلب یہ ہے چچی جان۔ ایسے بچے بہت حساس ہو جاتے ہیں، پڑھنے

میں کیسا ہے؟''

''اے بہت اچھا تھا مگر مار مار کر نویں تک گھسیٹا ہے۔ مدورو کر اسکول جاتا تھا کہ سب میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ تمھیں نہیں خبر دلہن ذرا ذرا سی بات پر دماغ چٹخا دیتا ہے۔''

''حساس ہے چچی جان، بہت محسوس کرتا ہوگا۔ دنیا بھی کسی کا احساس نہیں کرتی۔ خدا معلوم کیا کیا کہتے ہوں گے بچے۔''

''اے کے بجے تک لوٹے گی بارات؟ بارہ بجے سے پہلے تو نہیں آنے کے۔'' دادی جان نے بے زار ہو کر بات کا رخ موڑ دیا۔

''اے دلھن کے کمرے میں گاؤ تکیے رکھے تھے کہ نہیں؟ ننھے میاں جانا ذرا بھیا کے کمرے میں دیکھنا سرخ رنگ کے گول تکیے رکھے ہیں کہ نہیں۔ کہیں لڑکیاں اِدھر اُدھر نہ پٹخ گئی ہوں۔''

وہ حکم کی تعمیل کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہینڈل پر دباؤ ڈال کر دروازہ کھولا تو خوشبو کے جھونکوں نے والہانہ سواگت کیا۔ وہ کمرے کی خوبصورتی دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ آف وائٹ اور ریڈ کلر کا نہایت حسین امتزاج، آف وائٹ دیواریں سرخ مخمل کے پردے آف وائٹ فرنیچر، سرخ گدیاں، سرخ بیڈ شیٹ، سرخ تکیے، آف وائٹ زمین پر بڑے بڑے سرخ پھولوں والا کارپٹ، بیڈ کے اطراف گلاب، موتیا اور چنبیلی کی لڑیاں، پھولوں کی مہک اور ائرفریشر کی خوشبو، ننھے میاں نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ وسیع و عریض بیڈ پر دو تکیے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رکھے ہوئے تھے۔ ان کے اوپر مخملیں گاؤ تکیے موجود تھے۔ انھیں ایسا محسوس ہوا گویا اس کمرے کی ساری آرائش انھی کے لیے ہے۔ وہ تنہا نہیں ہیں۔ ایک گاؤ تکیے سے وہ پشت ٹکا کر بیٹھے ہیں۔ دوسرے سے ان کی شریک حیات تکیوں سے ان کی پشت اور دل دل سے ٹکے ہیں۔ وہ سحر زدہ سے گھوم گھوم کر کمرہ دیکھنے لگے۔

کارنس پر بھیا کی خوبصورت تصویر (کلوزاپ) فریم میں سجی ہوئی تھی۔ انھوں نے تصویر اٹھا کر بیڈ کی ملحقہ دراز میں ڈال دی۔

''ہمارے کمرے میں کسی تیسرے فرد کا کیا کام؟'' انھوں نے بیڈ کی طرف منہ کر کے اس طرح خود کلامی کی۔ جیسے ساتھی کی تائید چاہتے ہوں۔ ان کی تصوراتی دلھن شرما کر مسکرا دی۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے نفرت نہیں کر رہیں۔ مجھ سے بے زار نہیں ہو۔ دراصل پہلی ملاقات میں دلہن ذرا زیادہ ہی شرماتی ہے۔ میں منتظر رہوں گا اس وقت کا جب تم مجھ سے کھل کر دل کی باتیں کہو گی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تب بھی تم آنکھیں جھکا کر رکھا کرو گی۔''

''اے ہے ننھے میاں کمرے کے ہی ہو کر رہ گئے۔ اے کہیں گھونگھٹ کاڑھ سیج پر تو نہیں چڑھ بیٹھے؟'' چچی جان کی کھلکھلاتی آواز آئی۔

ہونہہ، گھونگھٹ! گھونگھٹ تو عورتیں کاڑھتی ہیں ''مرد'' تو سہرا باندھتے ہیں۔ بعض عورتیں چاہے کتنی عمر کی ہو جائیں مگر بے وقوف ہی رہتی ہیں۔ وہ خواب ٹوٹنے پر جھلاتے ہوئے باہر نکل آئے۔

''رکھے ہیں نا؟''

''کیا؟'' وہ کھوئے کھوئے سے بولے۔

''کیا دیکھنے گئے تھے؟'' دادی اماں نے ناگواری سے دیکھا۔

تب وہ گڑبڑا گئے۔ ''جی ہیں۔ دو ہیں۔ دو گول تکیے ہیں۔''

''اچھا تو تم گن رہے تھے اس لیے دیر ہو گئی۔'' شرارتی سی چچی جان نے انھیں پھر چھیڑا۔

انھوں نے بارہ بجے تک برات کی واپسی کا انتظار کیا۔ مگر زیادہ دیر تک جماہیاں نہ لے سکے پڑ کے سو گئے۔

صبح صبح ان کی آنکھ کھل گئی۔ سارے گھر پر سناٹا تھا۔ وہ گھبرا سے گئے۔ مگر باہر آ کر پتہ چلا کہ رات برات بہت دیر سے آئی تھی۔ سو نیند کو دیری کا تاوان دیا جا رہا ہے۔ یعنی سب بے ترتیبی سے پڑے سو رہے تھے۔ انھیں ایک دم دلہن دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ وہ بھیا کے کمرے کی طرف بڑھے۔ ہینڈل پر دباؤ ڈالا مگر دروازہ نہ کھلا۔ وہ مایوس ہو کر پلٹے اور منہ ہاتھ دھو کر کچن میں چلے آئے۔ اماں ناشتا تیار کرنے میں مصروف تھیں۔

''اماں ہمیں ناشتا دے دو۔ سب اٹھ جائیں گے تو.....'' انھوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ہاں ننھے میاں آپ یہاں آ جائیں۔ کیا بناؤں آپ کے لیے؟''

''فرنچ ٹوسٹ بنا دو'' وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

اماں جیراں نے دو انڈے پھینٹنے شروع کر دیے اور پوچھا ''منھے میاں بھابی پسند آئیں؟''

''ہم نے دیکھی ہی نہیں۔''

''کیوں؟''

''ہم سو گئے تھے۔''

''اے بہت خوبصورت ہیں۔ ماشاء اللہ۔ دیکھو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔''

''کب اٹھیں گی؟''

''ایک دو گھنٹے بعد اٹھا دیں گے۔''

''پورا منہ نیلا کنٹھ ہو رہا ہے آپ کا۔'' اماں جیراں نے انڈوں میں دودھ ملاتے ہوئے انھیں دیکھا تو وہ کھسیا سے گئے۔

''ہم شیو بنا کر آئے ہیں۔ ہم صبح صبح بنا لیتے ہیں۔ ورنہ سب چھیڑتے ہیں۔'' وہ دھیمی آواز میں بولے۔

''اے لو اس میں چھیڑنے کی کیا بات؟ یہ کون سی اچنبھے کی بات ہے؟ اس عمر کے لڑکے داڑھی مونچھ بناتے ہی ہیں۔'' انھوں نے آمیزے میں توس ڈبویا۔

وہ سر جھکا کر بیٹھ گئے گویا کوئی بات نہ کرنا چاہتے ہوں۔ مگر یہ سوچے بغیر نہ رہ سکے کہ اماں وہ لڑکے ڈھائی فٹ کے نہیں ہوتے۔

بوا نے ٹوسٹ کی پلیٹ ان کے سامنے میز پر رکھی اور ایک کپ میں چائے۔ وہ سر جھکا کر ناشتے میں مصروف ہو گئے باہر ہلکا ہلکا شور جاگ اٹھا تھا۔ تھوڑے بہت لوگ بیدار ہو گئے تھے۔ خواتین ہی تھیں غالباً۔ لڑکیاں تو اتنی جلدی اٹھنے سے رہیں۔

ناشتے کے بعد وہ باہر آ گئے۔ ہاں میں عجیب منظر تھا۔ وہ پردہ اٹھا کر ٹھٹک گئے۔ غالباً اس حصے کو صرف لڑکیوں ہی کا 'کیمپ' بنا دیا گیا تھا۔ ساری لڑکیاں خاندان ہی کی تھیں۔ سونے کے انداز بتا رہے تھے کہ جس وقت وہ سوئیں تھکن سے بے حال تھیں۔ معاً وہ چونک پڑے کونے میں فوم کا گدا بچھائے رخشندہ سو رہی تھی اس نے سیاہ پھول دار چادر اپنے جسم پر ڈال رکھی تھی۔ مگر پاؤں چادر سے باہر ہی تھے اور بازو آنکھوں پر سب سے زیادہ شائستگی تھی اس کے سونے کے انداز میں۔ انھیں خوشی سی ہوئی کہ وہ خود بہت خوش ترتیب اور

باسلیقہ تھے۔ یہی خصوصیات دوسروں میں دیکھنا پسند کرتے تھے۔ لڑکیاں اتنی تھک گئی تھیں کہ میک اپ اتارے اور لباس بدلے بغیر بے دم ہو کر سو گئی تھیں۔ کئی دنوں کی نیند پوری کر رہی تھیں آخر۔ انھوں نے دل ہی دل میں توبہ کی۔

امی جان نے انھیں دیکھا۔ ''ارے تم اٹھ گئے؟''

''میں تو بہت دیر سے اٹھا ہوا ہوں، ناشتہ بھی کر لیا ہے۔'' وہ ماں کو غور سے دیکھ کر بولے۔

''چلو اچھا کیا۔ ابھی تمھیں بھابی سے ملوائیں گے۔ رات تو تم سو ہی گئے تھے۔''

''آخر بھابی کو اٹھاتی کیوں نہیں؟''

''بس ابھی اٹھاتی ہوں۔''

اس نے دیکھا بھیّا نائٹ گاؤن میں ملبوس اخبار لیے برآمدے میں جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد یہ سن کر کہ بھابی جان اٹھ چکی ہیں، وہ وفورِ شوق سے بھیّا کے کمرے کو چلے آئے اور دروازہ کھول کر ذرا سا سر اندر کیا، دلہن سبز بنارسی شلوار سوٹ میں گیلے بال لیے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ خوشی سے اندر بڑھ آئے۔ دلہن نے دروازہ کھلنے پر آہستگی سے نظریں اٹھا کر آئینے میں دیکھا اور ایک دم خوفزدہ سی ہو کر گھوم گئی۔

چار پانچ سالہ بچے کے جسم پر ایک ''نوجوان سر'' تھا، شیو کی نیلاہٹوں سے مزین چہرہ، ہونٹوں پر خوش خلقی اور اپنایت سے پُر مسکراہٹ۔

''کون ہو تم؟'' دلہن نے پوچھا۔

''ہم؟'' وہ بڑی شان سے مسکرائے۔ ''ہم آپ کے دیور ہیں یعنی کہ آپ کے شوہر کے چھوٹے بھائی۔ بھیّا کے بعد ہمارا نمبر آتا ہے بھائیوں کی لائن میں۔'' انھوں نے تعارف کرایا مگر بھابی اب بھی انھیں بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''پہچان رہی ہیں؟ پہچان لیجیے سب کہتے ہیں ہم بھیّا سے بہت ملتے ہیں۔''

''آں؟ ہاں'' وہ دوبارہ گھوم گئی۔

اسی وقت دروازہ کھلا۔ جن لڑکیوں کو وہ اندر سوتا چھوڑ کر آئے تھے، ان میں سے اکثر اب اندر گھسی آ رہی تھیں۔ ہنستی، کھلکھلاتی۔ چھوٹی پھوپھو کی راشدہ نے انھیں دیکھ کر قہقہہ بلند کیا۔ ''ارے صاحب کر لیا بھابی جان کا دیدار؟ مگر کیا خالی، خولی؟''

''کیا دیں ہم؟'' انھوں نے بے چارگی سے پوچھا۔

''بھائی پانچ دس روپے تو دے دینے تھے منہ دکھائی میں۔''

''ہمیں دھیان نہیں رہا تھا۔'' انھوں نے شرمندگی سے اعتراف کیا۔

''آخر آپ کو کس کس چیز کا دھیان رہے۔ اپنے وسیع و عریض سراپے کو دیکھیں یا جہاں کے جھمیلوں کو؟ چلو بچہ سمجھ کر معاف کیا۔'' راشدہ نے ان کا گال تھپتھپایا۔

''بڑے ہیں ہم تم سے پورے دو سال۔'' راشدہ کی حرکت انھیں اپنی شدید توہین محسوس ہوئی۔ انھوں نے سر اٹھا کر راشدہ کی طرف دیکھا وہ بمشکل راشدہ کی کمر تک پہنچ رہے تھے۔

''ہاہا؟'' سب بے ساختہ ہنس پڑیں۔ بھابی بھی مسکراہٹ نہ روک سکیں۔

''ارے منّے میاں۔ آپ اگر بڑا کہلوانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں تو چلیں ہمیں آپ کی خوشی منظور۔ مگر ہماری نظر سے کوئی دیکھے۔ ہماری گود کے کھیلے لگتے ہو۔'' شوخ راشدہ نے بزرگوں کے انداز میں کہا تو ایک بار پھر ہنسی کا طوفان اُمڈ پڑا۔ وہ اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے باہر آ گئے۔ انھیں تو سب سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ رخشندہ کے سامنے ان کی توہین ہوئی تھی، کیا سوچ رہی ہوگی وہ؟

سامنے سے امی دونوں بڑی بھابیوں کے ہمراہ دلہن کے کمرے میں آ رہی تھیں۔ وہ رخ بدل کر لان کی جانب بڑھ گئے اپنی تقدیر کو رونے۔ بچہ..... بچہ انگارے ان کے کانوں میں اُتر رہے تھے۔ رخشندہ کتنا دھیان رکھتی ہے میرا۔ کیا سوچ رہی ہوگی وہ؟ راشدہ نے اس کے سامنے میری انسلٹ کی ہے۔

چند قدموں کے فاصلے پر بڑے بھیّا کا اپنا ذاتی چھوٹا سا کلینک تھا۔ وہ سرجن بھی تھے۔ ننھے میاں کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ انھیں اپنے بھائی کی محرومی بہت محسوس ہوتی تھی۔ اسپتال کا سارا عملہ انھیں آتے دیکھ کر خوش خلقی سے مسکرایا۔

''ارے ماجد صاحب آپ؟'' لیڈی ڈاکٹر رضوانہ محبت سے مسکرائیں۔ ''کیسے آنا ہوا؟''

''ایسے ہی ہمارا دل چاہ رہا تھا کہ گھوم کر آئیں۔'' وہ بے نیازی سے گویا ہوئے۔

''گویا سیر کرنے آئے ہیں۔'' وہ مسکرائیں تو ننھے میاں بھی مسکرا دیے۔

''ڈاکٹر صاحب تو آج ابھی تک نہیں آئے۔''

''ہاں بڑے بھیا آج گھر پر ہی ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔''

انھوں نے جان چھڑانے والے انداز میں جواب دیا اور بھیا کے کمرے میں، وارڈز میں، آپریشن رومز میں گھومتے گھومتے خاموشی سے باہر نکل آئے اور گھر جانے کے بجائے رخشندہ کے گھر گھس گئے۔ وہ مسکرائی۔

''آیئے صاحب۔ امی تو آپ کے گھر گئی ہوئی ہیں ملازمہ کا پوچھنے۔ آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟''

''گھر سے آ رہا ہوں۔'' وہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے بولے۔

''اچھا تو پھر بیٹھیں۔ آج کپڑے دھوئے ہیں۔ شادی میں خوب جمع ہو گئے تھے۔ ڈال کر ابھی آتی ہوں۔ پھر آپ کو چائے پلاؤں گی۔ ٹھیک؟''

انھوں نے بھی گردن ہلا دی اور دور دور سے اسے دیکھتے رہے۔ سرخ و سیاہ دھاری دار سوٹ میں وہ سکون دل کا سامان لگ رہی تھی۔ جانے کیوں انھیں ایسا محسوس ہوا کہ رخشندہ انھیں پہلے کی طرح لفٹ نہیں دے رہی۔ کچھ بدلی بدلی سی لگی تھی انھیں۔ وہ اداس سے واپس آ گئے۔

شادی میں آئے ہوئے دور کے مہمان آہستہ آہستہ رخصت ہو رہے تھے۔ چھوٹی پھوپھو نے ابھی مزید قیام کرنا تھا۔ وہ بڑے پر اسرار انداز میں خاموش اِدھر اُدھر گھوما کرتے تھے۔

راشدہ کو تیسری منزل پر ایک کمرہ دے دیا گیا تھا۔ سب سے بڑی بھابی بھی شور شرابے کی وجہ سے تیسری منزل پر ہی مقیم تھیں کافی نازک مزاج تھیں نا۔ ننھے میاں ہال میں، بیٹھے تھے۔ ہنسی کی آواز پر چونک پڑے۔ وہ دونوں ہنستی ہوئی سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ انھوں نے بہ غور دیکھا پھر اپنی کتاب میں گم ہو گئے۔

گہری نیند میں راشدہ کو اپنی ناک کے قریب عجیب سی بو کا احساس ہوا۔ بو بہت نزدیک آ گئی پھر ایک رومال اس کی ناک پر آ کر ٹھہر گیا۔ وہ اِدھر اُدھر سر پٹخنے لگی۔ اُوہوں، اوں ہوں..... ہوں..... کک..... ک..... کون ہے؟'' اس کی دم توڑتی ہوئی آواز ابھری۔

تیز تیز تنفس میں ننھے میاں خونی لہجے میں غرائے ''بچہ۔''

چاند اور گہن

اس نے کھڑکی پر سے پردہ ہٹایا۔ سامنے ہال نما کمرے میں غالباً پارٹی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ چم چم کرتے فرش پر پالش ہو رہی تھی اور دوسرے ملازم فرش پر چھاجوں چھاج پاؤڈر لنڈھا رہے تھے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ آج پارٹی اعلیٰ پیمانے پر ہو رہی ہے اور ڈانس کا بھی پروگرام ہے، جب ہی فرش کے نصیب میں یہ ''دل داریاں'' لکھی گئی تھیں۔ اس نے کراہیت سے آنکھیں میچ لیں، میرے مالک میں کب تک اس قید و بند کی صعوبتوں کو اٹھاؤں.....؟

یہ پارٹیاں جو کبھی کاک ٹیل پارٹی کبھی برج پارٹی، کبھی ایٹ ہوم پارٹی کے نام سے موسوم ہوتی ہیں اور کبھی کلب پکنک منائی جاتی ہے میں تو ان چیزوں سے شدید نفرت کرتی ہوں..... تو نے مجھے کس غلط جگہ پیدا کر دیا.....؟ نماز پڑھنے بیٹھتی ہوں تو انگریزی بیہودہ گانے میرے کمرے کی دیواروں کو زخمی کرنے لگتے ہیں..... اپنی ذات پر سوچنے بیٹھوں تو یہ مخلوط، بے ہنگم قہقہے میری روح کو رگید ڈالتے ہیں..... اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو برس گئے۔

''میری..... ہیلو..... میری۔'' مسز ترمذی کمرے میں ماما کے ساتھ داخل ہوئیں تو اس نے تیزی سے بہتے آنسو پونچھ ڈالے۔

''آداب آنٹی!''

''ہائے..... سوئیٹی!'' مسز ترمذی بولیں۔ ''تمھاری ماما نے شکایت کی کہ تم پکنک..... پارٹیز سے بالکل انجوائے نہیں کرتیں..... میں تمھیں سزا دینے آئی ہوں..... سزا یہ ہے، اسی وقت باہر چلو میرے ساتھ..... تمھاری ماما کہہ رہی تھیں کہ تم ان کی بات بالکل نہیں مانتیں..... نائی گرل!''

''سوری آنٹی! مجھے کچھ نوٹس تیار کرنے ہیں۔''

''اوہ۔ سلی گرل..... بعد میں ہو جائیں گے تیار..... ہم تم سے ویسے ہی امپریس ہے۔ بولتا تھا۔ مم..... میری (مریم) تو بائی فیس بالکل گریٹ تھنکر لگتی ہے۔ کیا کرو گی اتنا پڑھ کر۔ ہمیں نہیں ضرورت۔'' مسز ترمذی نے اس کا رخسار چوم لیا اور گھسیٹ کر باہر لے گئیں۔

اور لان میں وہ ہلڑ بازی تھی کہ اسے غش آنے لگے۔

''آغا! یہ میری بیٹی ہے۔ مریم..... مریم وقار.....'' ماما ایک اجنبی سے اس کا تعارف کرا رہی تھیں۔

گرے سوٹ میں ملبوس آغا عباس غوری نے اس کے سراپا کو دلچسپی سے دیکھا۔

''ہیلو..... مس مریم وقار!'' اتنے سارے لوگوں میں وہ واحد شخص تھا جس نے اس کا نام درست اور سلیقے سے لیا تھا۔

مگر اس کی آنکھوں کی آوارہ سی لپک نے اُسے اُس سے بھی کبیدہ خاطر کر دیا۔

''جی..... آداب!'' وہ اُٹھ کھڑی ہوئی..... ایک لمحے کو رُکی پھر لابی کی طرف بڑھ گئی۔

''سو چارمنگ۔'' آغا نے تعریف کی۔

''تھینک یو آغا!'' ماما نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا۔

.....

وہ رازیہ کے ساتھ بک اسٹال سے کتابیں لے رہی تھی کہ آغا عباس اپنی سیاہ مرزا سے اُترتا نظر آیا۔

''ارے، یہ تو شہزادہ معلوم دیتا ہے کہیں کا۔'' رازیہ نے پرس بند کرتے ہوئے فقرہ کسا۔

تب اس نے ماتھے پر ہزاروں بل ڈال کر رازیہ کو گھورا۔ وہ اسے گاڑی سے اُترتا دیکھ چکی تھی۔

''ہیلو مس مریم!'' وہ ان کے سر پر پہنچ گیا۔

''آداب۔'' وہ تیزی سے دکان سے باہر آ گئی۔

''ہوں..... مجھے تو ایسے گھور رہی تھی، شہزادہ کہنے پر کہ ٹانگیں ابھی تک کانپ رہی ہیں۔ مجھے تو مزے سے ہیلو کہا اس نے اور خود نے جواب بھی دیا..... کیوں جی.....؟''

''بھئی، بے کار باتیں نہ کرو۔ پاپا کے جاننے والے ہیں، میرے کچھ نہیں لگتے۔

تمھیں تو ہر کوئی شہزادہ یا ہر کولیس نظر آتا ہے۔ تھوڑا معیار کم کرو۔ ایسا نہ ہو کہ خواب ٹوٹ جائیں.....''

''اور تمہاری دلی آرزو پوری ہو جائے۔'' رازیہ نے جل کر بات کاٹی۔

''بھئی، مجھے یہ بے کار باتیں کرنے کا شوق نہیں۔'' اس نے ذرا نرم لہجے میں کہا۔

''صرف اس لیے کہ یہ ''بیکار باتیں'' خود چل کر تمھارے گھر جاتی ہیں۔'' وہ بگڑ سی گئی۔

''پاگل، ہر ایرے غیرے پر نظر نہیں رکھتے۔ ملے گا تو وہی جو مقدر میں ہے۔'' وہ کتابیں پچھلی سیٹ پر پھینک کر بولی۔

''او کے۔'' رازیہ ہنس پڑی۔

.....

''ایک تو میں تم سے عاجز آ گئی ہوں..... آخر اور بھی لڑکیاں ہیں، کس قدر انجوائے کرتی ہیں۔ میری بات تو تم اس طرح ٹالتی ہو جیسے میں تمھاری ملازمہ ہوں ماں نہیں۔ بس اب تمہاری شادی کر دینی ہی چاہیے۔''

''مگر ماما، میں تو پڑھ رہی ہوں۔''

''بہت پڑھ لیا..... جمشید تمھارے ڈیڈی کو بھی بہت پسند ہے۔ پھر اکلوتا اور دولت مند ہے۔ سب سے بڑھ کر وہ خود یہی چاہتا ہے۔''

''ماما..... پلیز ماما..... آپ یہ ظلم مجھ پر نہ کریں۔ خدارا ماما.....!'' وہ سسک اٹھی۔

''ظلم..... کیا مطلب ہے تمہارا.....؟'' وہ گرج اٹھیں۔

''ماما..... میرا مطلب ہے، میں ایسے لوگوں میں ایڈجسٹ نہیں ہو سکتی۔''

''کیوں نہیں ہو سکتیں۔ ہمارے اسٹینڈرڈ کے یہی لوگ ہیں۔ تمہارا کیا ارادہ ہے۔ کیا کسی کلرک کے پلے باندھ دیں یا..... دیکھو مریم! تمہاری عادتیں اب ناقابل برداشت ہیں خود کو چینج کرو..... ورنہ.....''

''آپ میری ماں ہیں..... کیا آپ میری شادی زبردستی کر دیں گی۔ ماما! کیا کوئی ماں اپنے ہاتھوں سے اپنے بچے کو قتل کر سکتی ہے..... مجھے جمشید بالکل پسند نہیں..... مجھے آپ سے ملنے والے سب امیر زادے ناپسند ہیں۔ اور پھر آپ نے تو میری بات میری پھوپھی سے کی ہوئی ہے۔''

''نان سنس۔ میں تمھیں اس گریڈ پندرہ کے ملازم سے بیاہ دوں۔ کبھی نہیں.....

بیٹی ہماری ہے..... جہاں ہمارا جی چاہے گا، ویں گے۔ خبردار، جو اَب یہ ذکر چھیڑا۔" ماما تیزی سے باہر نکل گئیں۔

وہ سسک پڑی..... آج پھوپھی کا آخری سہارا بھی ٹوٹ گیا۔ وہ دس سال پرانا قلبی تعلق بھی جو دو بھائی بہنوں نے اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کر کے قائم کر دیا تھا۔ وہ دیر تک روتی رہی۔

جانے کیا ہوا، شادی کے تذکرے ٹھنڈے پڑ گئے۔ سب سے حیرت ناک بات یہ کہ پارٹیاں بھی بہت کم ہو رہی تھیں۔ اب ماما پندرہ دن میں بیوٹیشن سے ملتی تھیں جبکہ پہلے ہر ہفتے جاتی تھیں۔" وہ حیران ہو رہی تھی کہ کان کے پاس اس زور کا بم پھٹا کہ اس کی دنیا تہس نہس ہو گئی۔ وہ لائبریری سے آ رہی تھی۔ گھر میں گھستے ہی دوسرے کمرے سے اس نے سُنا.....

"جب گزشتہ سال کاروبار میں خسارہ ہو گیا تھا تب میں نے ایک لاکھ روپیہ قرض لیا تھا آفریدی سے..... جبکہ میں نے اس کے تیس ہزار پہلے بھی ادا نہیں کیے تھے۔ جب یہ گھر بنوایا تھا جب لیے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ بیگم، تین سال میں اس نے خلوص کے دریا بہا دیے۔ پہلی بار اس نے جب مریم کا رشتہ مانگا تھا تو میں نے اسی وقت انکار کر دیا تھا۔ آفریدی مجھ سے صرف ایک دو سال چھوٹا ہوگا۔ میں اپنی بچی پر یہ ظلم نہیں کر سکتا تھا اور اب بیگم، وہ کہتا ہے قرض جلد ادا کر دو یا مریم کا رشتہ دے دو..... بیگم، میں اس قدر پریشان ہو گیا ہوں کہ جی چاہتا ہے، خود کو شوٹ کر لوں۔"

"ہمت سے کام لیں، ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ۔" ماں کی آواز مرتعش سی تھی۔

"کیسے ہو جائے گا؟ میرے اکاؤنٹ میں صرف تیس ہزار روپے ہوں گے۔ اب جبکہ دوسری دفعہ کا خسارہ..... میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"ایسا کیجیے، کسی سے قرض لے کر آفریدی کو دفع کیجیے۔"

"سب سے بات کر چکا ہوں..... کوئی دس ہزار سے زیادہ دینے کو تیار نہیں..... اُدھر مریم کی شادی کی فکر ہے۔ آغا عباس نے چند ماہ ہوئے مریم کا رشتہ مانگا تھا مگر میں نے انکار کر دیا تھا۔ صفیہ کی وجہ سے کہ اُسے زبان دے چکا ہوں، اب اس سے قرض کی بات کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے ورنہ اس سے کچھ امید تھی....."

"نہیں نہیں، آپ آغا سے ضرور بات کریں، ورنہ دوسری صورت میں....."

"بیگم! میری ایک بیٹی ہے۔ وہ بھی اس قدر فرماں بردار۔ میں اسے دکھ پہنچانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آفریدی تو کھلا بلیک میل کر رہا ہے..... سوچ رہا ہوں، گھر بیچ دوں۔"

"اوہ گاڈ.....! ذرا سوچیں تو سہی ہم نے کتنی چاہ سے گھر بنوایا ہے اور پھر ہماری توہین الگ ہوگی..... بات کا شہرہ ہو جائے گا..... کمال کرتے ہیں آپ.....؟"

"تو پھر تم ہی بتاؤ کیا کروں.....؟" وہ بے بسی سے بولے۔

"بس آپ کل فون کر کے آغا کو بلائیں۔ پھر اس سے بات چیت کے بعد دیکھیں گے۔"

وہ اپنے لرزتے وجود کے ساتھ کمرے میں آ گئی..... اب اسے واقعی پاپا پر ترس آ رہا تھا۔ ساتھ ہی غصہ بھی کہ پیسہ خرچ کرنے میں ذرا بھی احتیاط نہیں کرتے..... جو ماما نے کہا، وہ تو ضرور ہونا ہے..... انہی شاہ خرچیوں نے یہ دن دکھایا ہے..... اُف پتا نہیں یہ آغا عباس کیا جواب دیں۔

نیند اس کی آنکھوں سے بھی اُڑ گئی فطرتاً حساس جو تھی۔

وہ کچن میں ملازم سے صفائی کروا رہی تھی کہ پاپا کی آواز آئی۔

"اوہ..... نو..... آغا..... ہم نے تو اپنی غرض کے لیے یاد کیا ہے۔ آیئے ڈرائنگ روم میں آیئے۔ بیگم چائے کے لیے کہہ دیجیے۔"

ماما کچن کے دروازے پر ہی آرڈر دے کر رخصت ہو گئیں تب وہ ملازم کو ضروری ہدایات دے کر ڈرائنگ روم کے دروازے سے کان لگا کر کھڑی ہو گئی۔

"تو یہ بات ہے وقار صاحب!" آغا کی خوبصورت آواز کمرے میں گونجی۔

"دراصل آغا، میں شراکت دار ہوں، ذاتی فرم کا مالک نہیں۔ لیکن اس مرتبہ منافع کی اُمید بہت زیادہ ہے..... میں کوشش کروں گا کہ جلد ادا کر دوں۔"

"وقار صاحب! دس لاکھ روپے کی بات ہے، ڈیڑھ سو دو سو کی نہیں جبکہ میں بھی کاروباری آدمی ہوں اور دھوپ چھاؤں کے مقابلے پر رہتا ہوں۔"

"تو اس کا مطلب ہے۔" ماما نے مایوسی سے کچھ کہنا چاہا۔

"اوہ نو، مسز وقار۔ ایک بات ہے اگر آپ اسے میرے ظرف اور کردار کی کسوٹی

نہ بنالیں تو عرض کروں۔"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔" پاپا نے جلدی سے کہا۔

"آپ کو یاد ہے وقار صاحب، میں نے دو مرتبہ آپ کی بیٹی کا رشتہ مانگا تھا مگر آپ نے انکار کر دیا تھا۔"

"میں مجبور تھا آغا عباس! ورنہ کبھی انکار نہ کرتا بلکہ مجھے تو خوشی ہوتی..... مگر....." پاپا کا لہجہ شرمندہ تھا۔

"وقار صاحب! آج میں تیسری بار آپ سے آپ کی نیک سیرت بیٹی کا طالب ہوں۔"

"جی.....؟" پاپا نے حیران ہو کر کہا۔ "مگر ہم تو بات کر رہے تھے قرضے کی۔"

"جی، ابھی بھی وہی بات جاری ہے مگر ذرا ٹیڑھی ہو گئی ہے۔" آغا کا لہجہ مطمئن تھا۔

"میں سمجھا نہیں....." پاپا واقعی حیران تھے۔

"وقار صاحب، اگر آپ صاحبزادی مریم کا رشتہ دینا قبول کر لیں تو میں آپ کو دس لاکھ روپیہ دے سکتا ہوں۔ اپنی اس تحریر کے ساتھ کہ جب چاہیں واپس کریں یا..... خدا نہ کرے، مقصد یہ نہیں کہ میں آپ سے قیمتاً کوئی شے طلب کر رہا ہوں بلکہ وقار صاحب، یقین کیجئے..... میں مریم سے بہت متاثر ہوں..... اور..... یوں سمجھیے کہ جتنے ضرورت مند آپ ہیں اتنا ہی میں!"

آگے مریم سے نہ سُنا گیا..... اُدھر بڑے لوگوں کے بڑے داؤ پیچ ہیں..... میں اپنی جان دے سکتی ہوں.....، مگر..... وہ کمرے میں آ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ جسے دیکھو غرض سے بات کر رہا ہے۔ میرے ہی گھر میں میری قیمت لگ رہی ہے۔ پاپا..... ماما..... ایسے بیٹھے ہیں۔ جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ ہوں..... ان کے عیش و آرام میں فرق نہیں آنا چاہیے۔

تب ہی ماما اندر آ گئیں۔ اسے روتا دیکھ کر سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ سب سُن چکی ہے۔

"مریم بیٹے! تمہارے پاپا نے آغا کا رشتہ قبول کر لیا ہے۔ پرسوں تمہارا نکاح ہے..... بڑی خاموشی سے۔"

"ماما! رشتہ قبول کیا ہے یا منہ مانگی قیمت لی ہے.....؟ میں نہیں کروں گی آغا واغا سے شادی۔ مجھے آپ کے یہ اسٹینڈرڈ دوست ایک آنکھ نہیں بھاتے جو ہر شے کی تول زر سے کرتے ہیں۔"

"مریم! آغا کوئی معمولی انسان نہیں۔ ہمارے لیے تو کسی فخر سے کم بات نہیں کہ وہ ہمارا داماد بنے وہ تو تمہارے پاپا نے صفیہ کی وجہ سے انکار کر دیا تھا۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ آغا نے تمہارا رشتہ مانگا ہے تو میں پہلے ہی ہاں کر چکی ہوتی۔ وہ تو تمہارے پاپا کا دماغ خراب ہو گیا تھا..... ورنہ..... اور اب تو ہماری مجبوری ہے..... دیکھو مریم..... تمہارے پاپا بہت پریشان ہیں اگر تم نے انھیں مزید پریشان کیا تو وہ خودکشی کر لیں گے یا اس بوڑھے آفریدی سے تمہاری شادی کر دیں گے۔ آغا ہر لحاظ سے بہترین انسان ہیں۔"

"جی ہاں، جس کا عملی مظاہرہ وہ ابھی ابھی کر کے گئے ہیں۔" وہ طنزیہ بولی۔

"اس سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دل سے یہی چاہتا تھا، اب اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے۔ ورنہ ایک سے ایک لڑکی آغا کو مل سکتی ہے۔ تمہارے پاپا نے کہلوا دیا ہے، پرسوں شام چھ بجے تمہارا نکاح ہے۔ آغا اور ان کے دو دوست ہوں گے بس....." وہ تیزی سے باہر نکل گئیں پھر ایک دم اسی تیزی سے اندر آئیں اور بولیں۔ "اگر تم اپنی..... سہیلیوں کو بلانا چاہتی ہو تو فون کر دو..... او کے۔" وہ چلی گئیں۔

تب اس نے رازیہ کو فون کر ڈالا..... کچھ بھی نہ بتایا۔ صرف یہ کہا کہ آ جاؤ..... فوراً۔

وہ بے چاری ہانپتی کانپتی پہنچ گئی۔

"خیریت بھئی؟"

"خیریت ہوتی تو تمہیں بلاتی؟ دراصل پرسوں میری شادی ہے۔"

"شادی.....!" رازیہ کی چیخ نکل گئی۔ "مگر گھر میں تو کوئی آثار نہیں..... اچھا خیر کس سے ہو رہی ہے؟"

"ظاہر ہے، میں لڑکی ہوں کسی مرد سے ہی ہو گی۔" اس نے تڑخے ہوئے انداز میں کہا تو رازیہ کھسیا گئی۔

"میرا مطلب ہے، کیا نام ہے دولہا کا؟"

"ان کا نام "تاجر" ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"ہائیں..... "تاجر" ہے؟ بڑا ہی جداگانہ نام رکھا ہے ان کے والدین نے..... اگر وہ تجارت کرتے ہیں تو اسم بامسمّٰی ٹھہرے۔" رازیہ نے حسب عادت مذاق کیا۔ مگر اس کے موڈ کو دیکھ کر سنجیدہ ہو گئی۔ "لگتا ہے، تم خوش نہیں ہو۔ کیا وہ تمہارے کزن ہیں.....؟"

"نہیں بھئی۔ تم نے دیکھا تو تھا انھیں۔ جب ہم لوگ کتابیں لینے اردو بازار گئے تھے۔"

"اوہ، تمہارا مطلب ہے وہ شہزادہ۔" رازیہ نے خوشی سے چیخ کر کہا۔

"ہاں..... وہ تمہارا شہزادہ۔"

"میرا شہزادہ کیوں..... تمہی کو مبارک ہو..... سچ بڑی خوشی ہو رہی ہے..... یو آر موسٹ لکی۔"

"رازیہ.....!"

"کیا.....؟"

"تم نے غلام عباس کا "اوور کوٹ" پڑھا ہے؟"

"شاید!" رازیہ نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"بالکل اُسی طرح جس طرح اس نوجوان کے صاف اوور کوٹ اور مفلر کے نیچے سے پھٹی ہوئی گندی قمیص اور مٹی سے اٹا ہوا بدن برآمد ہوا تھا اسی طرح سے بعض اُجلے انسان اندر سے غلیظ، گندے اور آلودہ ملتے ہیں..... رازیہ میری بہن، مجھ پر ظلم ہو رہا ہے۔"

"پاگل اتنا اچھا ساتھی مل رہا ہے۔" رازیہ نے اسے گلے لگا لیا۔ "کیا بُرائی ہے اس سُپر مین میں؟"

تب وہ ہزار چاہنے پر بھی اپنے گھر کا پرابلم نہ بتا سکی کہ اس میں والدین کی ہتک محسوس ہو رہی تھی۔

ان دو دنوں میں تو اس نے آنسوؤں کے دریا بہا دیے۔ ماما نے تو اپنی بے نیازانہ طبیعت کے عین مطابق کوئی نوٹس نہ لیا۔ مگر وقار صاحب اپنے دل پر بوجھ لیے ہوئے تھے۔ اس کا رونا دھونا انھیں شرمندہ کیے دے رہا تھا۔

جب نکاح کے کاغذات سامنے کر کے کہا گیا۔

"لو بیٹی..... یہاں سائن کر دو۔"

تب ایک لمحے کو اس کا وجود طوفان کی زد میں آ گیا..... (اوہ میرے خدا)

"پاگل مت بنو مریم!" رازیہ نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ اور اس نے ایسی کیفیت میں سائن کیے جیسے کسی کا بغیر انجکشن کی دانت نکال دیا گیا ہو۔

"آغا عباس بہت بہت مبارک ہو۔"

"وقار صاحب آپ کو بھی۔" مختلف آوازیں اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔

سب لوگ مریم سمیت ڈرائنگ روم ہی میں تھے۔ نکاح کے بعد ڈنر تھا۔ کل سات آٹھ آدمیوں کے لیے۔ دولہا کا ایک دوست تھا، دوسرا چھوٹا بھائی۔

وہ آغا عباس کے پہلو میں ہی بیٹھی ہوئی تھی اور ان کا چھوٹا بھائی تصاویر اُتار رہا تھا۔

اور ڈنر کے بعد وہ خاموشی سے اسے رخصت کرا کر لے گئے۔ آغا عباس کی گاڑی میں صرف مریم اور آغا تھے۔ وہ بہت خاموشی سے گاڑی چلا رہے تھے۔

"آپ یقین کر سکتی ہیں آج میں کس قدر خوش ہوں؟"

"مجھے کوئی ضرورت بھی نہیں یقین کرنے کی۔ یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔" اس نے دھیمی اور ترش آواز میں کہا۔

وہ شاید اس کی آواز کے زیر و بم کو نہ سمجھ سکے تھے۔ خوش دلی سے ہنسے۔ "کیوں بھئی؟ آپ کو تو سب سے زیادہ ہماری ذاتیات میں دخل اندازی کا حق ہے۔ اور بیوی تو....."

"آغا صاحب! مجھے بیوی کہہ کر میری مزید توہین مت کیجیے۔ بیوی اور زر خرید میں بہت فرق ہوتا ہے۔"

"جی؟" انھوں نے ایک جھٹکے سے گاڑی روک دی۔ "کیا وقار صاحب نے.....؟"

"جی نہیں، وہ شاید ساری زندگی مجھ سے یہ بات کرنے کی ہمت نہ کر پاتے۔ میں نے خود اپنے کانوں سے آپ کی مہذب گفتگو سنی ہے۔"

"مریم! بلاشبہ یہ سب سچ ہے مگر میں مجبور تھا۔ اگر مجھے اس سے بھی زیادہ غلط قدم اٹھا کر آپ کو حاصل کرنا پڑتا تو شاید میں وہ بھی کرتا..... کہ مجھے بیوی چاہیے تھی شوپیس نہیں اور میں نے پہلی بار آپ کو دیکھ کر پروپوز کیا تھا مگر وقار صاحب نے انکار کر دیا تھا۔ جب آپ کو دوبارہ اردو بازار میں دیکھا، تب میں نے وقار صاحب کو فون کیا تھا..... انھوں نے کہا کہ آپ اپنے کزن سے منسوب ہیں تب مجھے بہت شاک پہنچا تھا..... اور اب....."

"اس بار بازی پوری آپ کے ہاتھ میں تھی۔" مریم نے بات کاٹ دی۔ "میں اپنے لب و لہجے پر معافی چاہوں گی..... کیونکہ میری اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے..... مگر آپ فکر نہ کریں۔ میں ایک کنیز سے بڑھ کر آپ کی خدمت کروں گی۔"

"مریم..... پلیز مریم، اس قسم کی باتیں نہ کریں..... میرے دل میں آپ کی

بہت قدر ہے۔'' آغا نے نہایت سنجیدگی سے کہا اور گاڑی چلا دی۔

''آیئے۔'' انھوں نے گاڑی روک دی۔ ''یہ رہا آپ کا گھر۔'' وہ دروازہ کھولے کھڑے تھے۔

وہ بھاری غرارہ سوٹ اور زیور سے بیزار باہر نکل آئی۔ ملازمہ نے سواگت کیا۔

''دلہن تو بہت خوبصورت ہیں مالک! بہت بہت مبارک ہو..... مالک، میں دیر سے رستہ دیکھ رہی تھی۔''

''انھیں کمرے میں لے جاؤ۔'' آغا نے ملازمہ سے کہا۔ ''میں ذرا ابھی آتا ہوں ایک ضروری فون کرنا ہے۔''

.....✿.....

''مریم!''

''جی..... ابھی حاضر ہوئی۔''

پھر وہ کچھ ہی دیر بعد سامنے کھڑی تھی۔

''آپ تیار ہو جائیں..... میرے ایک دوست کے ہاں ڈنر ہے۔ دیکھیں بہت اچھی طرح۔ یہ ڈنر آپ کے اعزاز میں ہے۔''

''بہت بہتر۔'' وہ ہولے سے کہہ کر مڑ گئی۔

''سنیں۔ اگر آپ وہ نیلی ساری پہنیں تو بہت اچھا ہوگا۔''

''جی بہتر.....!''

''دیکھیں، پورے سات بجے تک..... او کے!''

''بالکل سب کام آپ کے حکم کے عین مطابق ہوں گے۔'' اتنا کہہ کر وہ تیزی سے پلٹ گئی۔

.....✿.....

''کیا سر میں درد ہے؟''

''جی.....!''

''یہ ٹیبلیٹ کھا لیں۔''

''جی بہتر۔''

''ذرا میرے کپڑے نکال دیں۔ آج ضروری میٹنگ ہے..... واپسی پر شام کو آؤٹنگ پر چلیں گے..... ٹھیک ہے۔''

''جو آپ مناسب سمجھیں۔''

''کچھ آپ بھی مناسب سمجھ لیا کریں۔'' وہ ہلکی سی خفگی سے بولے۔

''جی اچھا۔''

''مریم..... مریم..... خدارا..... یہ کیا کسی فرماں بردار ملازم کی طرح جی اچھا..... جی بہتر..... کرتی رہتی ہیں.....؟ میں آپ کی ان حرکتوں سے عاجز آ گیا ہوں۔''

''معافی چاہتی ہوں..... مگر ایاز وارثِ تخت و تاج ہونے کے باوجود ایک لکڑی کا صندوق روزانہ کھول کر دیکھا کرتا تھا کیونکہ اس میں اس کے وہ کپڑے تھے جو وہ غلامی کے دور میں پہنا کرتا تھا۔ اور وہ لباس روزانہ اس لیے دیکھا کرتا تھا کہ اسے اپنی حیثیت یاد رہے کہ وہ پہلے کیا تھا.....''

''مریم، مریم۔ فار گاڈ سیک۔'' آغا نے جھنجلا کر کہا۔

''آغا! آپ جانتے ہیں، ایک خود مختار عورت کی کیا شان ہوتی ہے۔ جب وہ ایک بیٹی کی حیثیت سے باپ کے گھر میں ہوتی ہے تو اس کا الگ رنگ ہوتا ہے۔ جب اس کی ایک ایک ادا میں بے نیازی اور خود اعتمادی ہوتی ہے..... ذرا سی ناانصافی پر ماں سے لپٹ کر رونے والی۔ باپ سے شکوہ کرنے والی..... اس لیے کہ اسے اپنے انمول ہونے کا احساس ہوتا ہے..... اور آغا صاحب، جب کسی نازوں میں پلنے والی کی قیمت لگا دی جائے تو اس کی جذباتی و روحانی موت واقع ہو جاتی ہے..... آپ نے مریم کی قیمت لگا کر روحانی طور پر مریم کو ختم کر دیا ہے۔ ماں باپ نے آپ کے سپرد کر کے گویا فرض پورا کر دیا..... آغا! اگر میں چاند تھی تو آپ نے گہن لگا دیا ہے اور بڑے کہتے ہیں، چاند کو جب گہن لگتا ہے تو وہ سخت عذاب میں ہوتا ہے۔'' وہ تڑپ کر رو دی۔ ''آپ ذرا میرے۔ عذاب کا اندازہ تو کیجئے۔''

آغا اس حساس لڑکی کو دکھی نظروں سے دیکھنے لگے۔

''مریم، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ اس قدر حساس واقع ہوں گی۔ بخدا میرے ذہن میں تو کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ میں نے..... آپ کبھی یقین نہیں کریں گی مریم۔ کبھی نہیں۔ آپ کا حصول تو میری زندگی کا نصب العین بن گیا تھا اور میں نے تو اپنی

دانست میں موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اور پھر جتنی رقم میں نے وقار صاحب کو دی ہے اتنی رقم تو آپ کے اس گھر کی آرائش اور فرنیچر تبدیل کرنے پر لگ گئی ہے۔ اور میری تو تمام دولت آپ ہیں مریم...... خدا کے لیے یہ لغو خیالات اپنے ذہن سے نکال دیں۔''

''آپ نے پاپا کو رقم میرے نام پر کیوں دی، قرض سمجھ کر کیوں نہیں دی۔'' وہ بپھر کر بولی۔

''شاید آپ نے پوری گفتگو نہیں سُنی مارے غصے کے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اگرچہ میں نے آپ کو پانے کے لیے وقار صاحب کو اپنا ممنونِ احسان بنانا چاہا تھا...... مگر...... وقار صاحب نے میری اس بات کو بلکہ پیشکش کو مسترد کر دیا تھا کہ میں رقم معاف کر دوں...... انھوں نے کہا تھا کہ اس طرح وہ سمجھیں گے کہ انھوں نے اپنی بیٹی کی قیمت لگائی ہے۔ آپ کو پانے کا نادر موقع پا کر شاید میری ذہنی حالت نارمل نہیں رہی تھی۔ تب میں نے کہا تھا...... جب ان کا جی چاہے رقم لوٹا سکتے ہیں، خواہ بیس سال کیوں نہ لگ جائیں۔ یہ بات انھوں نے مان لی تھی...... مریم، میں نے آپ کے والد سے منت کر کے آپ کو مانگا ہے جبکہ آپ کو پانے کے مطالبے پر وہ بھی مجھ سے نالاں ہو گئے تھے! شاید آپ کو اپنی اہمیت کا احساس نہیں۔ دراصل آپ میں بے یقینی کی کیفیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ وہ کون سا شخص ہے جو آپ جیسی خوبصورت و نیک سیرت تعلیم یافتہ لڑکی کو پانے کی آرزو نہ کرے۔ وہ بھی اس بے لگام سوسائٹی کا...... میں نے مانا کہ میں بھی اس سوسائٹی کا فرد ہوں اور اسی کے چلن پر چلا بھی ہوں...... مگر خواہشات پالنے کے بعد خوب تر کی جستجو کرنا میرا انسانی حق ہے۔ مریم! میں آپ کی اس ''جی حضوری'' سے عاجز آ گیا ہوں...... اس ''جی حضوری'' میں بیوی کی فرماں برداری نہیں، ایک ملازمہ کا سا انکسار پایا جاتا ہے۔ آپ کو میں نے گواہوں کی موجودگی میں منکوحہ بنایا ہے...... جبکہ میری اور آپ کے والد کی گفتگو کا تو کوئی گواہ بھی نہیں۔ میں اتنا کم ظرف نہیں کہ...... آپ چاہیں تو حلف لے سکتی ہیں کہ میں نے کسی کی شریف بیٹی کو سیم و زر کی بدولت نہیں...... ہاں البتہ موقع سے فائدہ اٹھانے میں چوک ہو گئی...... مجھے آپ کے گھر میں شاید اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے تھا...... مگر اس عمل سے میرے جنون کا کتنا واضح اظہار ہوتا، کیا آپ ابھی بھی یقین نہیں کریں گی؟'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولے۔

''آ...... آغا...... عباس...... مجھے یقین نہیں...... کہ......''

''مریم، آپ مسلسل میری توہین کر رہی ہیں...... آپ اتنے عرصے میرے ساتھ رہی ہیں...... کیا سلوک کیا ہے۔ میں نے آپ کے ساتھ؟ آپ نے میرے بھائی سے جو تُرش روئی برتی تو اب وہ ویک اینڈ پر ہوسٹل سے بھی نہیں آتا...... میں نے آپ سے کچھ کہا؟ حالانکہ سوائے اس کے میرا کوئی بھائی بہن بھی نہیں۔''

''آغا! آپ نے میری پوری بات نہیں سنی۔ میں کہہ رہی تھی کہ آپ کو پہلے ہی بات صاف کر دینی چاہیے تھی تاکہ غلط فہمی نہ ہوتی اور ہاں...... میں بہت شرمندہ ہوں۔ آپ آغا رحمٰن کو فون کر کے بلائیں...... میں ان سے بھی معذرت کر لوں گی کہ وہ میرے واحد سسرالی ہیں۔''

''مریم!''

''جی......؟''

''اب تو چاند پر گہن کا عذاب نہیں......؟''

''آغا......'' وہ مسکرا پڑی۔

''میں پھر نہایت شرمندگی کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ موقع سے فائدہ اٹھانے میں، میں نے سخت بے احتیاطی کی کیونکہ میں آپ کو اغوا کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے یہ سب ہو گیا۔

عشق میں تو ذہنی توازن بگڑتے دیکھے ہیں۔
خاک بسری نصیب بنتے سُنی ہے۔
تخت و تاج ٹھکراتے دیکھے ہیں۔
مجھ سے بڑی عجلت و بے قراری میں چوک ہوئی۔
اس غلطی کو غلطی نہ کہیے۔
میرے جذبات ناپنے کا پیمانہ بنا لیجیے۔
جذبات میں آگ لگا دینے والی سرگوشیاں سُن کر
مریم پر ایک نئی دنیا کا انکشاف ہو رہا تھا۔
اسے کوئی ردِعمل سجھائی نہیں دیا تو بھاگ کھڑی ہوئی۔
بیوی کے بجائے ایک محبوبہ کا سا طرزِ عمل آغا عباس کے سر سے منوں بوجھ اُتار گیا۔

گھر اور گھروندہ

احسان کیا تھا میں نے تم پر نکاح کر کے..... اس نے گیلا تولیہ بیڈ پر پھینکا.....

ہاں تو اتار رہی ہوں تمہارا احسان..... جا رہی ہوں جگہ خالی کر کے..... کسی اور پر اس طرح کا احسان کر کے یہ خالی جگہ بھر دینا..... اس نے وارڈ روب کھول کر کپڑے بیڈ پر پھینکنا شروع کیے..... پھر وارڈ روب کے اوپری حصے سے ایک بیگ نکالا.....

ہر بات کی حد ہوتی ہے..... بس اب حد ختم ہو گئی ہے..... اس نے کپڑے تہہ کیے بغیر بیگ میں ٹھونسنا شروع کیے.....

تم ایک قدم یہاں سے باہر نکال کر دیکھو..... وہ غرا کر آگے بڑھا.....

کیوں کیا ٹانگیں توڑ دو گے؟ وہ چلائی.....

توڑ بھی سکتا ہوں..... وہ بھی اسی انداز میں گویا ہوا.....

قریب آ کر دیکھو..... یہ ڈائمنڈ چاٹ لوں گی..... کرتے رہنا میری لاش کے ٹکڑے اس نے انگلی لہرا کر انگوٹھی دکھائی.....

وہ ایک لمحے کو ٹھٹکا..... کچھ سوچا..... پھر ایک دم پینترا بدل کر اس پر جھپٹا وہ مچلتی تڑپتی رہ گئی..... اس نے انگوٹھی تقریباً کھسوٹ لی..... اور جیب میں ڈال کر اسے چھوڑ دیا.....

کوئی اور طریقہ سوچو اب..... مرنے کا.....

آپ کی تو مرضی ہی یہ ہے کہ..... خیر..... اب آپ کو پریشان ہونے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں..... میں جا رہی ہوں ہمیشہ کے لیے..... راستہ صاف ہے..... وہ دوبارہ بیگ میں کپڑے ٹھونسنے لگی.....

اتنا آسان نہیں ہے یہ سب..... وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا..... اور بڑی پھرتی

سے دروازہ بند کر کے باہر سے لاک لگا دیا..... اور خود کچن کی طرف چل دیا جہاں بوا کی موجودگی یقینی تھی.....

حریم بری طرح دروازہ پیٹ رہی تھی.....

بوا یہی شور سن کر کچن سے باہر آ چکی تھیں..... باہر نکلتے ہی معید کو سامنے پایا.....

کیسا شور ہے میاں.....؟ وہ پریشان نظر آئیں.....

کچھ نہیں..... کوئی خاص بات نہیں..... میں امی کی طرف جا رہا ہوں..... کھانا وہیں کھاؤں گا..... اس نے بے نیازی سے جواب دیا.....

بوا اس کی بات پر توجہ دینے کے بجائے دروازے کی دھڑ دھڑ سن رہی تھیں.....

دروازہ کھولو..... بالآخر چیخ پکار بوا کے پلے پڑ ہی گئی..... پلٹ کر تعجب سے معید کی طرف دیکھا..... کیوں بند کر دیا..... یہ کیا بات ہوئی؟

ابھی دو چار گھنٹے اسے چیخنے رونے دو..... تھوڑی دیر میں ٹھنڈی ہو جائے گی۔ وہ لاپرواہی سے شانے جھٹک کر بولا.....

''ٹھنڈی''.....؟!! بوا ہونق سی ہو گئیں.....

میرا مطلب ہے خاموش ہو جائے گی..... وہ جھلایا.....

خاموش.....؟ بوا پھر بے دھیانی میں الجھ گئیں..... حریم کی چیخ پکار نے حواس معطل کر رکھے تھے۔ اب اتنا بھی جھگڑا نہیں کہ آپ ''ٹھنڈی'' اور ''خاموش'' کی گہرائیوں میں اترنے لگیں..... خدانخواستہ اب یہ نوبت بھی نہیں آئی کہ آپ یہ سوچنے لگیں کہ ''میں اس کے گلے میں پھندا لگا کر باہر آ گیا ہوں اور وہ لحہ بہ لحہ ''ٹھنڈی'' یا ''خاموش'' ہو رہی ہے..... اے میاں..... اللہ نہ کرے..... بوا کے تو حلق میں کانٹے پڑ گئے..... کیا حوصلہ مندی ہے۔ کیا ڈھٹائی..... میں کیوں ایسا سوچنے لگی..... میں نہیں سن رہی کوئی بات۔ پس آپ دلہن کو کھولو..... وہ قطعی انداز میں مصر ہوئیں.....

''کھولوں؟'' کیا مطلب..... بھینس بندھی ہوئی ہے جسے کھولوں..... تاکہ وہ کہیں کھلی ہریالی میں جگالی کرتی پھرے..... نانسنس.....

زیادہ فرکس آزمانے کی کوشش نہ کرنا..... میں خود آ کر لاک کھول دوں گا.....

امی کی طرف جا رہا ہوں..... وہیں کھانا کھاؤں گا.....

بوا اے میاں..... اے میاں کرتی رہ گئیں اور وہ بائیک کی طرف بڑھتا چلا گیا.....

.....✿.....

امی تو دو قدم کے فاصلے ہی پر تھیں کسی بھی وقت پول کھل سکتی تھی جبکہ اس کا موڈ تھا وہ اسے کم از کم تین چار گھنٹے تو مزہ چکھائے..... یار حد ہوگئی اپنے لائف پارٹنر کے مزاج کو نہیں سمجھتی..... شک کرتی ہے..... نمک یا چینی ہوں جسے لڑکیاں گھول کر پی جائیں گی..... آخر انسان ہوں بندہ بشر ہوں..... کسی کو ذرا سا غور سے دیکھ لیا تو کیا ہوا..... کیا اسکر بن کر چپک گئی وہ..... کسی سے ذرا ہنس کر بات کر لی تو دوسرے نکاح کا ایجاب وقبول ہو گیا..... نالائق یہ بھی نہیں سمجھتی کہ آخر کار کبوتر اپنی چھتری پر ہی آئے گا.....

اس نے اسپیڈ تیز کی اور سی سائیڈ کی طرف رخ موڑ دیا.....

راستے سے ایک برگر اور بروسٹ پیک کرایا اور ساحل سمندر پر تنہا پکنک انجوائے کرنے کی سر توڑ کوشش کی.....

کافی دیر کی چہل قدمی کے بعد اسے دھیان آیا کہ اب چلنا چاہیے..... بس بہت ہو گیا باقی آئندہ سہی.....

گھر میں داخل ہوا تو مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں ساتھ ہی گھر کی اندرونی فضاء کسی تقریب کا منظر پیش کر رہی تھی.....

تینوں بہنیں اپنے بچوں سمیت موجود تھیں..... جن کے بچوں کا ''کلیکشن'' یوں سمجھا جاتا تھا کہ سخت ترین جنگی محاذ پر بھیج کر ممکنہ بلکہ حیرت انگیز کامیابی و فتح حاصل کی جا سکتی ہے.....

اس پر مستزاد سلطانہ پھوپھو جن کو وہ سلطان ''پھوپھو'' کہا کرتا تھا اور اکثر و بیشتر یہ قول ان کو سناتا رہتا تھا کہ ''جابر سلطان کے آگے کلمہ حق کہنا جہاد ہے''..... اس پر وہ اس سے ناراض ہی رہتی تھیں کہ بھتیجا انھیں کافر کہتا ہے، اور ان کے سامنے آتے ہی حالت جہاد میں آ جاتا ہے.....

اسی آن کچن سے نکلتے ہوئی ماں پر بھی نظر پڑ گئی..... لمحہ بھر کو تو چکرا کر رہ گیا ہو گئی سیر تفریح..... آ گیا گھر کا خیال..... اس لیے الگ گھر کر دیا تھا کہ کچھ ذمہ داری پیدا ہوگی..... سنجیدگی آئے گی..... کوئی عقل کے کام ہوں گے.....

سالن میں سے دھنیا نکالیں..... راشدہ (بہن) کے چار سالہ بیٹے نے ایک دلدوز چیخ مار کر نانی کی صلواتیں اور ماموں کا سلام سب خلط ملط کر دیا..... راشدہ ایک کونے میں بیٹھی اسے کھانا کھلا رہی تھی..... اس نے معید کو سلام کیا تھا مگر اس نے سنا نہیں تھا.....

بھائی..... یہ کیا حرکت کی.....؟ کسی طرف سے راشدہ سے بڑی رینا نکل آئی تھی بہت ملامت بھرے انداز میں دریافت کر رہی تھی.....

کونسی حرکت.....؟ ابھی تو میں نے زاویہ بھی نہیں بدلا..... اس نے ذرا ننھا بننے کی کوشش کی.....

اگر انھیں کچھ ہو جاتا خدانخواستہ..... رینا سے بڑی ربیعہ بھی آ موجود ہوئی تھی ارے اس کی بلا سے..... دلہن سے کہا بھی تھا..... مت پریشان کرو کسی کی بچی کو..... پہلے اپنے نور چشم کو سدھا لو.....

کیا میں ڈنگروں، مویشیوں میں سے ہوں..... جسے سدھانے کے منصوبے بن رہے ہیں..... ''سلطان پھوپھو'' کے حملے نے تو تن بدن میں جیسے آگ ہی لگا دی..... وہ جانے کب آ گئی تھیں..... شاید ربیعہ کے پیچھے آئی تھیں..... ارے ان سے بھی پرے..... امی جان نے سیخ پا ہو کر اضافہ کیا.....

بھائی..... بھابی کوئی لاوارث نہیں ہیں۔ ان کا میکہ انھیں اتنا پیار نہیں کرتا ہوگا جتنا پیار انھیں سسرالی کرتے ہیں۔ آخر آپ کیا سمجھ کر انھیں اس طرح بند کر کے چلے گئے تھے۔ ربیعہ نے بھی باقاعدہ حصہ لیا.....

اس کو کیا اس کی طرف سے جان سے چلی جاتی..... ''سلطان پھوپھو'' کی دیرینہ ناراضگی پھوٹ پھوٹ کر باہر نکلنے لگی.....

شرم نہیں آتی کیا منہ دکھائیں گے ہم اس کے ماں باپ کو..... کتنا خوش رکھ رہے ہیں ہم ان کی بچی کو..... امی جان نے بڑی برہمی سے اس کی سمت دیکھا.....

تو کیا صرف میرا ہی قصور ہے..... وہ تو جیسے دودھ پیتی ہے..... وہ جھلایا..... ان کی حالت دیکھیں ذرا..... رینا نے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی.....

آپ لوگ دیکھیں میں دیکھتا رہتا ہوں.....

دیکھ رہی ہو دلہن اس کی ڈھٹائی..... سلطان پھوپھو بھاوج سے مخاطب ہوئیں۔

دیکھ رہی ہوں آپا..... مگر میں اسے سیدھا کر کے ہی اب یہاں سے جاؤں گی..... امی جان نے نند کو پوری پوری تسلی دی.....

ارے وہ تو بوا کو سوجھی..... غریب ہانپتی کانپتی پہنچی..... کتنی مشکل سے ہم نے تالا توڑ کر اسے باہر نکالا.....

توڑ دیا تالا.....؟ چائنا کا تھا..... وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ مگر درمیان میں روک دیا گیا۔ چولہے میں گئے تمھارے چین جاپان..... امی جان بھڑک گئیں.....

میرا خیال ہے..... وہ بہت عاجزی سے کچھ کہنے لگا۔

بھاڑ میں گیا تمہارا خیال..... اندر جا کر حال دیکھو اس کا..... شرم آنا چاہیے تمھیں..... اسے اذیت دی ہم سے جھوٹ بولا..... سارا دن گناہ کمانے میں گزار دیا..... کوئی انسانیت کی بات ہے..... شرم آ رہی ہے ہمیں..... امی جان بے حساب گرم نظر آئیں.....

ہاں بس..... مجھے ہی کہیں سب..... وہ تو جیسے کچھ کرتی ہی نہیں۔ اس کی بعض باتیں اتنی ناقابل برداشت ہیں کہ آئندہ اس سے زیادہ بھی کچھ ہو سکتا ہے..... وہ بھی پینترا بدل کر ناراضگی ظاہر کرنے لگا.....

سترہ سال میرے پڑوس میں رہی ہے..... میرے سامنے پلی بڑھی ہے۔ اس سے اچھی طرح شناسائی ہے..... اس کی ایک ایک عادت میری سامنے ڈھلی ہے..... تمہاری ماں ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ غلط باتوں میں تمہاری حمایت کروں گی..... یعنی حد ہو گئی..... اگر خدانخواستہ وہ کچھ کر بیٹھتی..... بات کرنے کی ضرورت نہیں مجھ سے..... وہ ماتھے پر لاتعداد بل ڈال کر کچن کی طرف چلیں.....

یہی تو زعم ہے اسے کہ سارا سسرال ہم نوالہ و ہم پیالہ ہے.....

جس لڑکی میں صلاحیت ہوتی ہے اسی کا سسرال ہم نوالہ ہم پیالہ ہوتا ہے۔ ایسی سیدھی بچی..... سلطان پھوپھو نے اس کی بات کاٹ کر گویا چٹکی بھری.....

سیدھی..... ہونہہ..... بے وقوف اچھا بنا لیتی ہے سب کو.....

ارے..... سارا چہرہ اس کا خون سے بھرا ہوا تھا، کمرے میں گھستے ہی مجھے تو چکر آ گئے۔ ع..... خون..... وہ بدحواس ہو کر مزید کچھ سنے کمرے کی طرف بھاگا..... حریم کی پیشانی پر پٹی بندھی ہوئی تھی..... وہ بیڈ پر بالکل چت لیٹی ہوئی تھی آنکھیں بند تھیں.....

یہ کیا کر لیا.....؟ شرافت سے دو چار گھنٹے لاک ہو کر نہیں گزارے جا سکتے..... وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیے بہت تاسف بھرے انداز میں اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا.....

وہ اسی طرح ساکت و صامت لیٹی رہی.....

زبان بھی اینٹھ گئی ہے..... طبیعت کی طرح؟ وہ اسی طرح گویا ہوا.....

کچھ پیسے لے کر بولو گی؟

اچھا یہ بتاؤ..... سر دروازے میں مارا تھا یا دیوار میں؟

ویسے تمھارے میک اپ کا کیا ہوگا..... کتنا گہرا زخم ہے۔ کب تک پٹی کھل جائے گی؟ بات کرنے کی ضرورت نہیں مجھ سے..... وہ جیسے پھٹ پڑی.....

صرف ضرورت کے تحت بات نہیں کی جاتی..... ہم مطلبی نہیں ہیں بہت بے لوث اور سادہ و معصوم ہیں..... وہ بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا۔

اس معصومیت پر دن اور رات قربان ہو رہی ہوں..... وہ جل کر بولی تھی.....

اللہ اللہ..... معید نے بڑی ادا سے چھیڑا.....

جائیں آپ یہاں سے..... اس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا.....

کہاں جاؤں..... باہر تو تمھارے حمایتیوں کا رش لگا ہوا ہے..... جو مجھے چیل کوؤں کی طرح نوچنے کو تلے بیٹھے ہیں..... جو گیدڑ سنگھی ان کو سنگھائی تھی مجھے بھی سنگھائی ہوتی تو آج یہ پرابلمز پیدا نہ ہوتیں.....

آپ جاتے ہیں یا امی کو آواز دوں..... وہ چلائی.....

جا رہا ہوں بابا..... وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا.....

.....✿.....

شاید دنیا میں اس طرح کی فطرت بہت سے مردوں کی ہوتی ہوگی..... جو ہر پُرکشش عورت کی طرف لازماً توجہ فرماتے ہیں..... اور صرف دیکھ کر ہی بہت تسکین حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ شاید کوئی نفسیاتی عارضہ ہی ہوتا ہوگا.....

وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا..... مگر اس وقت وہ بہت عذاب میں مبتلا ہو جاتی تھی۔ جب وہ اس کی موجودگی ہی میں کسی لڑکی کو اتنی اٹینشن دینے لگتا تھا کہ یہ بھی بھول جاتا تھا کہ بیوی بھی ساتھ ہی ہے..... اور کس طرح سلگ سلگ کر خاک ہو رہی ہے.....

اتنی آؤ بھگت کرتا تھا کہ وہ تڑپ کر اپنی جگہ چھوڑ کر کہیں اور بیٹھ جاتی تھی..... بعد میں اسے بہت سمجھاتا تھا کہ وہ تو ''اخلاقیات'' نباہ رہا تھا..... اس کی نیت خراب نہیں تھی..... وہ تو بس اس کا دل ہی ایسا ہے کہ وہ کسی کو ''اگنور'' نہیں کر سکتا..... اس کی شادی کے فوراً بعد ہی اس کی نند کے ہاں کوئی شادی ہوئی تھی۔ وہ اپنی ساس نندوں کے ساتھ کئی دن پہلے سے وہاں پہنچی ہوئی تھی..... راشدہ کے سسرالیوں میں سے بھی بہت سے مہمان آئے ہوئے تھے انھیں میں ایک پری چہرہ محترمہ بھی تھیں۔ اس نے کئی مرتبہ معید کو اس سے بات چیت کرتے ہوئے دیکھا تھا مگر اس عمل کو اتفاقات میں سے سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا.....

لیکن جب ڈرائنگ روم میں دونوں کو تنہا بہت خوشگوار موڈ میں باتیں کرتے دیکھا تو لمحے بھر کو سناٹے میں رہ گئی..... یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت پرانی دوستی ہو۔ وہ اسی وقت چھوٹے بھائی کے ساتھ بائیک پر بیٹھ کر واپس آ گئی تھی اور رو رو کر جان آدھی کر لی تھی.....

بعد میں وہاں ڈھونڈ پڑی تو پتہ چلا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ گھر چلی گئی ہے.....

وہ یہ سنتے ہی گرتا پڑتا اس کے پاس پہنچا تھا.....

اور طبیعت کی خرابی کی وجہ جان کر بڑی بے نیازی سے بولا تھا..... بہت دقیانوسی اور نیرو مائنڈڈ ہو..... ذرا سی بات چیت سے کیا ہو جاتا ہے۔ جہاں اتنا رش ہوتا ہے وہاں کسی نہ کسی سے بات چیت رہتی ہی ہے.....

تب وہ واقعی شرمندگی محسوس کرنے لگی تھی جیسے واقعی وہی غلط ہو.....

اس دن کے بعد اس نے پھر اس طرف توجہ نہیں دی تھی..... لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ مختلف اوقات میں شدید احساسِ توہین سے دوچار رہنے لگی۔ یعنی بھری محفل میں وہ اسے بھول جاتا تھا اور کسی مہ رو و مہ جبیں کی دیکھ بھال، میں لگ جاتا تھا۔ وہ دقیانوسیت کے طعنے سے بچنے کے لیے برداشت کر جاتی تھی..... لیکن اندر ہی اندر یہ بات اسے گھن کی طرح کھا رہی تھی۔

اور تو اور اس نے خواتین کی قربت حاصل کرنے کی ایک ٹرک بڑی زبردست حاصل کر لی تھی..... یعنی نیم حکیم قسم کا پامسٹ بن گیا تھا..... بس کوئی تقریب ہوتی اور لڑکیاں اسے گھیر کر بیٹھ جاتیں..... معید بھائی پہلے میرا ہاتھ دیکھیں..... پہلے میرا..... مختلف

پچ (Pitch) اور ویولینتھ (Wave length) کی حاصل آوازیں زبردست شور پیدا کرنے لگتیں.....

وہ رابعہ اندر بنا..... کیرو کا جانشین دکھائی دیتا..... بہت اعتماد سے نازک سے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر مستقبل کی پیش گوئیاں کرنے لگتا..... وہ اندر کی کھولن مٹانے کو بار بار ٹھنڈا پانی پیتی.....

جھگڑا ہونے کی نوبت سے پہلے وہ کمال ہوشیاری سے ہینڈل کر لیتا تھا.....

یار ہر لڑکی بیوی تھوڑا ہی ہوتی ہے.....

بیوی تو بس ایک ہی ہوتی ہے.....

یا یہ کہ کوئی لڑکی بیوی کی برابری تو نہیں کر سکتی..... بیوی سے تو سب سے قریب ترین رشتہ ہوتا ہے..... دنیا کا کوئی رشتہ اتنا قریبی نہیں ہوتا.....

یوں سمجھو ایک روح کے دو سائے ہوتے ہیں..... وغیرہ وغیرہ.....

اور وہ جیسے واقعی ریلیکس ہو جاتی..... بہل جاتی..... اپنی بدگمانیوں پر خود ہی شرمندگی محسوس کرنے لگتی.....

آہستہ آہستہ جیسے وہ عادی ہو رہی تھی اس لیے کہ وہ بہرحال اس کا بے حد خیال کرتا تھا..... دکھ بیماری میں تو تیمارداری کا حق ادا کر دیتا تھا..... زندگی ایک ڈھب پر چل ہی پڑی تھی.....

کہ اس کی بڑی بھابی نے جیسے اسے کسی خواب سے جگا دیا.....

تم کیسی بیوی ہو..... ایسے رنگ رنگیلے خاوند کو کھلا چھوڑ رکھا ہے۔ مان لیا ہم نے کہ وہ بہت براؤ مائنڈڈ اور پروگریسو ہے..... لیکن کسی لڑکی کی کیا گارنٹی ہے وہ تو اس کی مستقل قربت کی خواہشمند ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے وہ خوش شکل ہے..... خوش لباس و خوش انداز ہے..... جاب اچھی ہے..... تم پڑی سوتی رہنا کوئی کام بھی دکھا سکتی ہے خدانخواستہ.....

گویا یہ سُن کر تو اسے پنکھے لگ گئے تھے..... اندر ایسی ہول شروع ہوئی تھی کہ ساری ہستی تلپٹ ہونے لگی تھی.....

اوہ..... واقعی..... اس طرف تو میں نے سوچا ہی نہیں..... ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں بھابی..... آج اس کے قطعی احتجاج پر جھگڑا بہت بڑھ گیا تھا۔ بات بھی پڑوس کی تھی۔ موصوف

کو معید سے لفٹ کیا ملی کمبل ہی ہو گئیں..... جب دیکھو موجود..... خاص طور پر ان اوقات میں جب معید کی گھر میں موجودگی یقینی ہوتی تھی.....

کھٹکی تو وہ اس وقت تھی جب محترمہ نے ''بھابی'' کے بجائے حریم باجی کہنا شروع کیا تھا کبھی کڑھائی گوشت لیے چلی آ رہی ہیں کہ اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے.....

کبھی چکن اسٹکس یہ کہتی ہوئی لا رہی ہیں کہ انھوں نے ''رنگون والا'' سے کوکنگ کا کورس کیا ہوا ہے.....

کبھی رات دس بجے ان کا فون ''ون وے'' ہو جاتا تھا اور انھوں نے کوئی ضروری فون کرنا ہوتا تھا جو انھیں دس بجے ہی یاد آتا تھا..... لہٰذا وہ پڑوس سے فون کرنے آ جاتی تھیں۔ ایک منٹ کے فون کے بعد پھر بیس منٹ معید کی خیر خیریت دریافت کرتی تھیں.....

اور معید یوں کھلا جاتا تھا کہ گویا اس کے خزاں رسیدہ چمن میں بہار آ گئی ہو.....

بس اسی بنیاد پر ہفتے بھر سے جھگڑا چل رہا تھا.....

آج حد ہو گئی جب اس نے یہ جملہ کہا کہ نکاح کر کے تم پر احسان کیا ہے..... چھ لڑکیوں کی وجہ سے تمہاری اماں بلڈ پریشر کی مریضہ بن رہی تھیں تو اپنی والدہ کی درخواست پر میں نے تم پر غور کیا تھا.....

یہ سننے کے بعد تو اسے اس گھر میں ایک منٹ گزارنا عذاب لگ رہا تھا۔ احساسِ توہین سے انگ انگ سلگ رہا تھا..... اب وہ بس اسی انتظار میں تھی کہ کب سسرالی جائیں اور وہ بھی اس گھر سے نکلے.....

اب وہ کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھی.....

.....✿.....

ساس نندوں اور سلطان پھوپھو کے جانے کے بعد جب معید واش روم میں تھا تو وہ چادر اوڑھ کر گھر سے نکل آئی تھی..... یوں جیسے کوئی ہمیشہ کے لیے مقام چھوڑتا ہے۔

سر پر بندھی پٹی دیکھ کر گھر بھر ہی ہول گیا تھا اس پر یہ کہ وہ تنہا آئی تھی۔ ورنہ وہ ہمیشہ معید کے ساتھ ہی آتی تھی.....

اس نے ہر مصلحت بالائے طاق رکھ کر صاف صاف بتا دیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے آ گئی ہے..... اور دروازے سے سر ٹکرا کر یہ چوٹ اس کی اپنی ''ذاتی کوششوں'' کا نتیجہ

ہے..... اس کی امی کا تو بلڈ پریشر ہائی ہو گیا تھا..... تین بہنیں ماں کی خدمت میں اور دو اس کی دلجوئی میں لگ گئیں.....

امی نے وجہ دریافت کی تو وہ بھی اس نے بلا کم و کاست بیان کر دی۔

جس پر واقعی ان کی حالت غیر ہو گئی..... وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ معید ایسا غیر ذمہ دار و رنگین مزاج ہو گا.....

اللہ اللہ کر کے تو ایک کے فرض سے سبکدوش ہوئی تھیں..... اب پھر دوبارہ وہی ''فیگر'' ہو رہی تھی.....

بیوگی کے دکھ کیا کم ہوتے ہیں اس پر مستزاد بیٹیوں کی ذمہ داریاں..... کافی دیر بعد جب ان کے اوسان واپس ہوئے حواس بحال ہوئے تو انھوں نے اسی وقت معید کی والدہ کو رنگ کیا.....

ان کی آواز سے محسوس ہوا جیسے وہ بہت گہری نیند سو چکی تھیں..... لیکن یہ پتہ چلتے ہی کہ حریم وہاں پہنچی ہوئی ہے وہ تو لمحوں میں نیند کے غلبے سے باہر آ گئیں..... حریم کی والدہ نے کہا.....

نہ میری بیٹی کی شکل بری ہے نہ وہ جاہل ہے..... ہم اس کی توہین بہرحال برداشت نہیں کر سکتے..... لہٰذا اب آپ لوگ کسی صلح جوئی کی کوشش کے چکر میں نہیں پڑیں..... اور معید سے کہیں جہاں منہ مارنا چاہے مارے..... ہماری طرف سے اسے مکمل اجازت ہے..... آپ کو اپنے بیٹے کے لچھن دیکھ کر بھی خوفِ خدا نہیں آیا کہ آپ کسی یتیم بچی کے ساتھ کیا کرنے جا رہی ہیں.....؟ یہ کہہ کر انھوں نے ریسیور رکھ دیا.....

.....✿.....

رات دو بجے کا عمل تھا..... جب معید کی امی اور ''سلطان پھوپھو'' معید کے ہمراہ گھر میں داخل ہوئیں..... انھوں نے بہت جوش و جذبے سے سلام کیا تھا۔ مگر جواب بڑی سرد مہری کے ساتھ ملا تھا.....

معید کی والدہ کی شرمندگی..... دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی..... وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی اتنی ندامت ظاہر کر رہی تھیں..... گویا کسی بہت بڑے جرم کا ارتکاب کر کے فارغ ہوئی ہوں..... اس وجہ سے حریم کی والدہ قدرے نرم پڑتی نظر آ رہی تھیں.....

یہ ناسمجھی کی باتیں ہیں..... بچے عموماً کر جاتے ہیں..... انھوں نے حریم کی والدہ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی.....

یہ ناسمجھی نہیں ہے..... آوارگی ہے۔ گمراہی ہے..... پرائی بچیوں کو بہکانا بھٹکانا مغالطے میں ڈالنا..... یہ ناسمجھی ہے.....؟ گمراہی کی انتہا ہے۔ حریم کی والدہ نے پہلی فرصت میں یہ دلیل مسترد کی.....

لیکن..... آپ یہ تو جانتی ہیں کہ غلط کو صحیح کرنے کے مواقع اور راستے ہمیشہ موجود رہتے ہیں..... معید کی والدہ نے پھر ایک مضبوط دلیل دی.....

بڈھے طوطے نہیں پڑھائے جاتے..... ہم اپنی بچی کو مزید بے عزت کرانے کی ہرگز مہلت نہیں دیں گے.....

اس دھوکہ بازی میں آپ بھی برابر کی شریک ہیں کیا آپ کو اپنے بیٹے کے بارے میں کچھ پتہ نہ ہوگا..... لے پالک تو نہیں ہے سگا بیٹا ہے آپ کا حریم کی والدہ نے ہر گنجائش ختم کرتے ہوئے قطعی اور حتمی انداز میں بات کی.....

آنٹی..... پلیز..... معید ایک دم بلبلا کر بول اٹھا..... (Honest)

یہ بہت زیادتی ہے میرے ساتھ..... میں حریم کے ساتھ بہت آنسٹ ہوں..... میں نے اسے دل سے قبول کیا ہے..... تو اس سے شادی کی ہے..... میں دوسری شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتا..... میرے گھر اور دل کی مالک صرف حریم ہے۔

پاؤ بھر خون نکلوا دیا ہے تم نے بے چاری مالکن کا..... سلطان پھوپھو نے چمک کر جملہ فٹ کیا.....

بات چیت کرنے سے کیا انسان بے وفا کنفرم ہو جاتا ہے۔ معید نے قدرے ناراضگی سے دریافت کیا.....

بیٹے مرد عورت کا سمبندھ آگ اور پھونس کا سمبندھ ہے۔ ایک ان دیکھی تلوار سر پر جھولتی رہتی ہے..... کبھی بھی کہیں بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے..... ہو سکتا ہے کہ تمہاری نیت بات چیت سے زیادہ نہ ہو..... مگر فطرت کے حساب آگے کیا کچھ ہو سکتا ہے اس کا اندازہ قبل از وقت تم بھی نہیں لگا سکتے.....

امی معید کو سمجھاتے ہوئے ساتھ ساتھ سمدھن کے تاثرات بھی دیکھتی جاتی تھیں.....

بھئی کوئی بھی عورت یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کا میاں اسے بھول کر دوسری عورتوں کو واہ واہ کر رہا ہو..... آج نہیں تو کل ایسے مرد کا گھر ٹوٹنا ضرور ہے اب تم ننھے بن کر ہماری آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش نہ کرو..... معید کی ساس بغیر گنجائش کے بات کر رہی تھیں.....

بیٹے عورت ہر دکھ میں خوشی خوشی حصہ دار بن جاتی ہے۔ شوہر کی محبت اس کا حوصلہ بڑھاتی ہے..... شوہر کی بے توجہی اسے اس کی نظروں میں گرا کر اس کا اعتماد چھین لیتی ہے..... یہ کسی نیک دل و پرخلوص عورت کے ساتھ بہت زیادتی کی بات ہے.....

تم بات لمبی کرنے کے بجائے اپنی ساس سے معافی مانگو..... حریم سے معذرت کروامی نے بڑے سبھاؤ سے معاملہ نمٹانے کی کوشش کی.....

ہر گھر کچا گھروندا ہے..... باہمی خلوص اور ایک دوسرے پر اعتماد ہی گھر کو مضبوط بند ہے.....

بہرحال تم غلط ہو وہ بالکل صحیح ہے..... اس کا محور مرکز تم ہو..... تو تمھیں بھی چاہیے کہ تم اپنی توجہ کا محور اور مرکز صرف اسی کو بناؤ.....

لیکن امی میں تو اس کے ساتھ بہت سنسیئر ہوں آپ قسم لے لیں۔ وہی مجھے ٹوکتی ہے..... جھگڑتی ہے..... بلیم کرتی ہے.....

دماغی توازن درست نہیں ہے اس کا..... حریم کی امی بھڑک گئیں۔

بہن..... آپ ذرا خود کو پرسکون رکھیں..... مجھے امید ہے اسے اپنی غلطی کا احساس ضرور ہو رہا ہوگا..... آپ گنجائش رکھ کر بات کریں..... اسی میں ہم سب کی بہتری ہے.....

مگر آپ نے وہ مثل تو سنی ہوگی چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ حریم کی امی نے چیخ کر کہا.....

میں ضامن ہوں..... ذمہ دار ہوں آپ موقع تو دیں..... حریم میری بہو نہیں میری بیٹی ہے..... اس کی گواہی حریم خود بھی دے گی۔ معید کی امی نے بہت دوستانہ انداز و مسکراہٹ کے ساتھ کہہ کر ان کے ہاتھ تھام لیے.....

''اس کو اچھی طرح سمجھا دیجیے جو مرد عورت کا دل نہیں جیت پاتا، وہ ساری زندگی

سچی خوشی کو ترستا۔۔۔'' حریم کی امی کے انداز میں اس مرتبہ گنجائش بہت واضح تھی.....

''آپ نے بالکل ٹھیک کہا.....'' معید کی والدہ نے نند کی طرف دیکھ کر گویا تائید کی جو کافی دیر سے معید کو کچھ کہنے کے لیے مناسب الفاظ مرتب کر رہی تھیں.....

''حریم کہاں ہے آنٹی.....؟'' معید نے کھڑے ہو کر جھجکتے ہوئے ساس سے پوچھا۔

''اوپر ہوگی.....'' انھوں نے اس طرح کہ ناراضگی مصنوعی محسوس ہوئی.....

''بچوں سے غلطیاں تو ہو ہی جاتی ہیں، بڑے کس لیے ہوتے ہیں؟'' انھوں نے ناراض سمدھن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بہت محبت سے کہا.....

''ہوں.....'' انھوں نے باہر نکلتے ہوئے معید کو دیکھ کر ہنکارا بھرا.....

''اگر غلطی مان لی جائے تو موقع ضرور دینا چاہیے۔''

''اگر گنجائش رکھنے کی رسم ختم ہو جائے تو جگہ جگہ ٹوٹے ہوئے گھروں کا ملبہ دکھائی دے.....''

حریم کی امی نے معید کی والدہ کی طرف بہت مطمئن مسکراہٹ کا تحفہ روانہ کیا..... جن کی سمجھ داری کی وجہ سے ان کا بلڈ پریشر نارمل ہو رہا تھا.....

اوپر معید..... اپنی کوتاہی کے تدارک میں مصروف تھا۔

برسرِ روزگار عورت

ابو..... شمع باجی کی شادی پر حنا اور ربیعہ نے وبکے کے کام کی پشوازیں سلوائیں ہیں۔ ہم اتنی کلوز کزن ہیں اس لیے چاہتی ہیں کہ بارات والے روز ایک سے کپڑے پہنیں..... ہمیں پشواز بنوا دیجئے ناں..... نغمانہ عرف نغی نے بڑے دلار سے فرمائش کی.....

کتنے میں بن جاتی ہے پشواز.....؟ عارف حسین نے گردن موڑ کر کپڑوں کی سلائی کرتی بیگم سے دریافت کیا۔

یہ تو وبکے کے کام کی کہہ رہی ہے..... وبکے کا کام ہی ہزار دو ہزار تک میں ہوگا کپڑا تو اتنا زیادہ مہنگا نہیں آتا..... وہ مشین روک کر بولیں.....

بیٹی..... آپ کو تو پتہ ہے کہ میں اتنے مہنگے کپڑے افورڈ نہیں کر سکتا..... اور بیٹا کبھی کسی کو دیکھ کر تمنائیں پروان نہیں چڑھاتے چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے ہیں..... اسی میں انسان کی عزت ہوتی ہے..... ادھار قرض کر کے قیمتی ملبوسات کی نمائش تو بڑی شرمندگی کی بات ہوتی ہے..... اپنی حیثیت کے مطابق لباس پہن کر اعتماد سے لوگوں سے گھلنا ملنا چاہیے..... عارف حسین نے پیار سے بیٹی کو سمجھایا.....

ابو تو اپنی حیثیت بڑھانے کی جدوجہد کرنا چاہیے..... دوسرے لوگ بھی تو بہت کچھ جدوجہد ہی سے حاصل کرتے ہیں..... اس نے اپنے حساب سے مضبوط دلیل دی.....

جی بیٹا..... آپ نے بہت اچھی بات کہی جو کہ ایک پُرامید انسان کو کرنا چاہیے۔ مگر آپ ایمانداری سے تجزیہ کرو..... میں ہاتھ پیروں کا تمام وظیفہ پورا کرتا ہوں، وقت ضائع نہیں کرتا اپنے اہل وعیال کے لیے اپنی اہلیت وصلاحیت کو درست سمت میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہوں جس کے نتیجے میں آپ سب بہن بھائی اچھا کھانا پیٹ بھر کھا لیتے ہیں آپ لوگوں کے تعلیمی اخراجات بغیر اُدھار قرض کے پورے ہو جاتے ہیں..... کسی کے

سامنے ہاتھ پھیلانے سے حتی الامکان گریز کرتا ہوں اس سے جو اس گھرانے کی عزت و ساکھ ہے وہ میری تمام محنت کا حاصل ہے..... کاروباری اہلیت میں خود میں نہیں پاتا اس لیے کبھی یہ رسک لینے کی کوشش نہیں کی..... ملازمت سے فارغ ہو کر دو گھنٹے کی ہوم ٹیوشن کرتا ہوں اس سے مجھے اضافی آمدنی ہو جاتی ہے۔ تمام کام سہولت سے ہو جاتے ہیں میں مطمئن ہو جاتا ہوں..... عارف حسین نے بڑی شفقت کے ساتھ بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا..... ابو اللہ میاں نے اس دنیا میں بے شمار اچھی اچھی نعمتیں بکھیری ہوئی ہیں وہ انسانوں کے لیے ہی تو ہیں..... انھیں حاصل کرنے پر کوئی پابندی تو نہیں ہے..... انسان کو خوب سے خوب تر کی کوشش تو کرتے رہنا چاہیے ناں.....؟ اس نے ''پشواز'' کے حصول میں ناکامی کی وجہ سے قدرے اداس لہجے میں کہا.....

آف کورس..... بالکل کرنا چاہیے..... پوزیٹو وے میں اسے اپنی تمام صلاحیتوں کو استعمال کرنا چاہیے..... جب تک تھکن نہ ہو اور نیند سے آنکھیں بند نہ ہونے لگیں اسے اپنے قیمتی وقت کے لمحے لمحے کا حساب رکھنا چاہیے..... ایک لمحہ بھی فضول ضائع نہ ہو۔ اگر ایسا ہو تو وہ بہت کچھ حاصل کر لیتا ہے جیسا کہ اللہ نے بھی کہا ہے کہ انسان کو وہی ملا جس کی اس نے کوشش کی اور ایک بات کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے کہ ہماری ساری بھاگ دوڑ اور سعی کا حاصل ایک عزت کا احساس ہو اس لیے کہ انسان کے پاس بہت ساری نعمتیں ہوں مگر عزت نہ ہو تو وہ صحیح معنوں میں حاصل نعمتوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا وہ اسی طرح حلم کے ساتھ جواب دے رہے تھے.....

آپ نے ٹھیک کہا ابو..... کوشش ضرور کرنا چاہیے..... میں بھی اپنے تمام خواب حاصل کرنے کی کوشش کروں گی..... وہ خود کلامی کے انداز میں کہتی ہوئی کھڑی ہو گئی.....

عارف حسین کے ہونٹوں پر بڑی مطمئن سی مسکراہٹ تھی کہ بیٹی نے ضد کرنے کے بجائے ان کی بات سمجھنے کی کوشش کی.....

.....✿.....

اسے ہٹاؤ صابرہ بھابی..... ہندوستان میں سب سے پہلے روپیہ..... چاندی کا روپیہ ہمارے علاقے میں آیا تھا..... یعنی ہمارے گھر میں..... دنیا دیکھنے آئی تھی کہ ذرا دکھانا روپیہ کیسا ہوتا ہے سب سے پہلے تو تمہاری اماں ہی پہنچیں تھیں..... اس عمر میں کیوں شیخی

مارتی ہو..... کرسی میز تک تو تمہارے گھر میں اس وقت بھی نہیں تھی جب پاکستان بنا تھا..... چٹائی پر بیٹھ کر تمہارا رشتہ مانگا تھا.....

اُنو بوا کے جذبات کی تندی کا اندازہ ان کے چلتے سروتے کی رفتار سے لگایا جا سکتا تھا۔ اے تو میں یہ کب کہہ رہی ہوں کہ جب تم میرا رشتہ مانگنے گئیں تو میرے ابا کلکتہ کے کمشنر لگے ہوئے تھے..... کہاں سے آ گیا تھا تمہارے گھر میں چاندی کا روپیہ..... باپ تمہارے فروٹ بیچتے تھے..... دمڑی آنے کا کاروبار..... چاندی کا روپیہ ان کو کون تھما گیا.....؟ تمہاری تو سدا کی عادت ہے..... میں نے تو سنا ہے تم اجو پنسار کی بیوی کو بتا رہی تھیں، کہ تمھیں گائے بھینسیں اور ایک ان کا دودھ دوہنے والا جہیز میں ملا تھا..... بکری باندھنے کی تو جگہ نہیں تھی تمہارے گھر میں صابرہ دادی نے غم و غصے کی کیفیت میں اپنی چھ انچ کی چوٹی کا جوڑا کھول کر دوبارہ باندھنا شروع کر دیا.....

تو گھر میں بندھی بھینسیں ہی تو جہیز میں نہیں دی جاتیں..... ہمارے بڑے ماموں کا مویشیوں کا کاروبار تھا..... میری شادی پر سب قریبی رشتے داروں نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق تحفے تحائف دیے تھے..... بڑے ماموں بولے میرے پاس تو اس وقت نقد کچھ نہیں کاروبار مندا ہے میں تو اسے گائے بھینسیں ہی دے سکتا ہوں اب اس کے سسرال والوں کی مرضی..... دالان میں باندھیں یا فروخت کریں ہماری عادت نہیں تمہاری طرح بڑی بڑی ہانکنے کی..... انو بوا نے سیخ پا ہو کر جواب دیا تو ہمیں کیوں دکھائی نہ دیں تمہاری وہ گائے بھینسیں.....؟ صابرہ دادی جل کر بولیں.....

وہ دفتری لوگ تھے پڑھے لکھے..... تو کیا گھر میں باندھتے؟ رکھ چھوڑی تھیں کہیں بعد میں ہمارے مرد نے بزازی شروع کی تو فروخت کر دیں..... غلطی ہوئی ہم سے ہمیں چاہیے تھا ان کا فوٹو کھنچوا کر بڑی بیٹھک میں لٹکا دیتے..... انو بوا نے بھڑک کر جواب دیا.....

توبہ دادی جان آپ لوگو سے بھی حد ہے..... بالکل ہندوستان پاکستان لگتی ہیں آپ دونوں..... اتنا قریبی رشتہ اور اتنی سنگین دشمنی..... کبھی تو آپ لوگ اچھی اچھی باتیں کر لیا کریں..... نعمی نے کچن سے باہر آ کر دونوں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تمھیں ہمارے بیچ کودنے کی ''ضروت'' (ضرورت) نہیں بیوی..... جاؤ اپنے کام سیدھے کرو انو بوا نے آگ بگولا ہو کر اس کو جھاڑا.....

میں تو ہمدردی کر رہی ہوں انو دادی..... اس عمر میں ہائی بلڈ پریشر بہت خطرناک ہوتا ہے..... آپ لوگوں کو اپنا خیال کرنا چاہیے.....

ارے آئی بڑی کہیں سے..... تیری دادی کا منہ بند کیا تو تجھ سے دیکھا نہیں گیا آ گئی ہمدرد بن کے..... انو بوا نے پھر اسے جھاڑا..... ہائی بلڈ پریشر اور دائی بلڈ پریشر کرتی ہوئی وہ مزید گویا ہوئیں.....

اے لو..... اب بچی کے پیچھے پڑ گئیں لٹھ لے کر..... تمہاری تو عادت ٹھہری انو بوا چلتی ہوا سے دو دو ہاتھ کرتی چلتی ہو..... صابرہ دادی نے پھر اپنے پاندان میں جھانکنا شروع کر دیا.....

ہاں بی بی..... ہم تو ٹھہرے پپا پپا کٹنی..... تمہاری سسرال میں بنی کس سے..... ہماری اماں اسی غم میں مر گئیں کہ بہو نے انھیں بڑا نہیں سمجھا..... انو بوا جل کر بولیں.....

تو بیوی..... اماں بھی وہ تمہاری تھیں..... غم تو انھیں چھو کر بھی نہیں گزرا تھا وہ غم کھانے نہیں غم لگانے آئی تھیں..... اللہ بخشے ہمارے سسر کو جانے کیا روگ لگا تھا ان کو پچاس برس کی عمر میں ہی دنیا چھوڑ گئے..... عورت کے سکھ کو ترستے چلے گئے..... صابرہ دادی نے بھی ٹرکی بہ ٹرکی جواب دیا۔

ہاں اب تم ہماری مری ماں کے جنم میں بھی کیڑے ڈالو گی..... انو بوا برافروختہ ہو کر بولیں..... مجھے کیا پڑی ہے تمہاری بات کا جواب دیا ہے میں نے تو انو بوا..... صابرہ دادی بے نیازی سے پان پر کتھے چونے کا لیپ کرنے لگیں.....

یا اللہ..... دادی جان آپ دونوں اتنے عرصے سے اکٹھے کیسے رہ رہی ہیں؟ اگر آپ نند بھاوج کے بجائے میاں بیوی ہوتیں تو کبھی کی طلاق ہو چکی ہوتی..... بائیس تیئس سالہ نغمانہ نے اپنا چکراتا سر تھام کر کہا.....

چپ کر لونڈیا..... کیا گز بھر کی زبان منہ میں دھری ہے..... خبردار بڑوں کے بیچ بولی انو بوا نے پھر بری طرح نغمانہ کو جھاڑ دیا.....

کل میرا پیپر ہے دادی..... میں پیپر میں کیا لکھوں گی..... سب پڑھا بھول گئی ہوں۔ بس آپ لوگوں کے تیر تلوار جیسے جملے دماغ میں چبھ رہے ہیں.....

تو تجھے کس نے کہا ہے ہماری باتیں سننے کو..... جا جا کر اپنی پڑھائی کر بڑی کمشنر

لگے گی کہیں..... انو بوا نے جھاڑ پلائی۔

انشاء اللہ..... کوشش تو کروں گی..... کمشنر بن جاؤں..... اور تمام شہر کی بوڑھی عورتوں کے لیے ایک آرام دہ گھر بناؤں گی تاکہ اس میں بند کر دوں جہاں وہ خوب جی بھر کر لڑیں..... انھیں کوئی ٹوکنے والا نہ ہو..... وہ لڑ لڑ کر خوش خوش زندگی گزاریں اور مرتے دم تک مجھے دعائیں دیں..... نغمانہ نے شریر انداز میں کہا اور واپس کچن میں گھس گئی.....

دیکھ رہی ہو اپنی لاڈلی کی گز بھر کی زبان..... بہو تو تمہاری سویرے کی نکلی ہوئی ہیں بیٹی کو چولہا ہانڈی سونپ کر..... دیکھو آج کیا کھانے کو ملتا ہے.....؟

توبہ اس عمر بھی تمھیں کھانے کی پڑی رہتی ہے انو بوا..... کمر سیدھی کرنے کو دو نوالے بہت..... صابرہ دادی نے جل کر انو بوا کی بات کاٹ دی.....

ہاں..... تم تو سوکھتی ہو..... بہو تو صبح سویرے تمھیں ہریرے کھلاتی ہے..... انو بوا پھر پھٹ پڑیں.....

تمھیں کوئی رُدکتا ہے ہریرے کھانے سے..... کیوں جل جل کر اپنا خون سکھاتی ہو؟ صابرہ دادی بولیں پھر مزید گویا ہوئیں.....

اللہ رکھے میری بہو بہت نیک بخت ہے..... اسی لیے نیک کاموں کی توفیق دی ہے اللہ نے تمہاری بہو کی طرح نہیں کہ چار دن کو چلی جاؤ تو برتن پٹخنا شروع کر دیتی ہے۔ صابرہ دادی نے پھر اٹیک کیا.....

سیدھے سیدھے یہ کیوں نہیں کہتیں کہ تمھارے بیٹے کے در پر پڑی ہوئی ہوں..... اللہ میری طرح کسی کو بے آسرا نہ کرے..... انو دادی اتنا کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں.....

ارے..... یہ انو بوا کو آج کون مرا ہوا یاد آ گیا.....؟ وقار عرف وکی نے گھر میں داخل ہوتے ہی انو بوا کو روتا ہوا پایا..... وقار نغمانہ سے دو برس چھوٹا تھا..... اس نے اپنے تجربے، کی بنیاد پر یہ جملہ کہا تھا..... عموماً انو بوا بیٹھے بیٹھے رو پڑتی تھیں..... گھر والے بدحواس ہو کر پوچھتے انو بوا کیا ہوا.....؟

تو وہ مزید زور شور سے روتے ہوئے کہتیں..... اے۔ ہے اللہ بخشے جنت مکانی اماں یاد آ گئیں..... ان کے ہاتھ کا بیسن کا حلوہ مجھے بہت پسند تھا۔ جب بھی بناتی تھیں کٹورا

بھر مجھے ضرور بھجواتی تھیں۔ گیارہ گھروں کا تو فاصلہ تھا میرے میکے اور سسرال میں.....

آپ کو حلوہ زیادہ یاد آ رہا ہے یا لماں..... سچ سچ بتائیں..... وقار شرارت سے پوچھ بیٹھتا اور پھر اس کی شامت آ جاتی لماں اور حلوہ ایک طرف ہو جاتے کبھی اپنے کپڑے دھوتے دھوتے (اپنے کپڑے وہ خود دھونا پسند کرتی تھیں) بلند آواز سے گریہ زاری شروع کر دیتیں۔ پوچھا جاتا کیا ہوا؟

جواب ملتا.....

ارے بڑے ماموں یاد آ گئے..... کیسے کیسے تازہ مکھن کے پیڑے کھلائے ہیں مجھے..... بہت لاڈ کرتے تھے میرے.....

انو بوا آپ کو سارے مرحومین کھانے پینے کی سوغاتوں کے ساتھ ہی کیوں یاد آتے ہیں؟ کبھی کوئی مرحوم ایسا یاد آیا جس نے زندگی میں آپ کو کچھ نہ کھلایا ہو اور آپ اسے یاد کر کے روئی ہوں ایک مرتبہ وقار سے چھوٹے شانی نے بڑی سادگی سے پوچھ لیا تھا جس کے جواب میں اسے انو بوا کی ڈھیروں صلواتیں سننے کو ملی تھیں.....

نغمانہ کچن میں مصروف تھی مگر اس کا ذہن کہیں دُور کی سیر میں مصروف تھا اسی لیے اسے ماں کی آمد کا احساس نہ ہو سکا.....

چولہے کی آنچ تو دھیمی کرو نغمی..... کہاں دھیان ہے..... ماں کی آواز پر وہ واقعی چونک پڑی ارے..... امی جان آپ آ گئیں..... کہیں نہیں..... بس یونہی دادی جان اور انو بوا کی تکرار پر کچھ خیال آ گیا تھا..... وہ قدرے خجل سی ہو کر آنچ دھیمی کرنے لگی.....

لو..... آج پھر ''معرکہ'' ہوا ہے کیا.....؟ خالدہ بیگم فرج کھولتے کھولتے رک کر پوچھنے لگیں آپ اُدھر سے گزر کر ہی تو کچن میں آئی ہوں گی..... کیا کر رہی تھیں دونوں؟ نغمی نے حیرت سے ماں کی صورت تکی۔

نہیں..... برآمدے میں انگنائی میں تو کوئی نہیں ہے البتہ تخت پر پاندان رکھا ہوا ہے جس کا مطلب ہے لماں نماز کو اٹھی ہوں گی..... انو بوا بھی نماز کی تیاری کر رہی ہوں گی۔ ارے نہیں امی جان وہ وقار آ گیا تھا ناں اس کو دیکھ کر اِدھر اُدھر ہو گئی ہوں گی..... بہت گھبراتی ہیں اس سے میں تو جھاڑ کھا کر دبک جاتی ہوں مگر وہ باز نہیں آتا..... میدان میں ڈٹا رہتا ہے..... نغمی مسکرائی تو خالدہ بیگم کی مسکراہٹ بھی معنی خیز تھی.....

آج کس موضوع پر ''ڈیبیٹ'' رہی.....؟ اور کون جیتا..... خالدہ بیگم نے فرج سے پانی کی بوتل نکالی اور ڈور بند کرتے ہوئے ہنستے ہوئے پوچھا.....

موضوع تو انو بوا نے سلیکٹ کیا تھا یعنی ''پدرم سلطان بود'' (میرا باپ سلطان تھا) نغمانہ کو اردو لٹریچر سے بہت دلچسپی تھی اس لیے اس کی اردو بہت نکھری ہوئی تھی..... ماں بھی پڑھی لکھی تھیں..... جملہ سن کر بہت محظوظ ہوئیں اور بولیں.....

توبہ وہی گھسا پٹا موضوع..... عاجز نہیں آئیں انو بوا..... اور ہماری لماں نے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہار مانی ہوگی..... مگر ان کے معرکے سے تمھیں کیا خیال آیا کہ تمھیں آس پاس کا ہوش نہیں..... کیا سوچ رہی تھیں؟ خالدہ بیگم نے بیٹی کی محویت کو بہت گہرائی سے نوٹ کیا تھا ایک تجسس سا لاحق ہوا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی تھی وہ اس کے سر پر کھڑی تھیں اور اسے ہوش نہیں تھا.....

کچھ نہیں امی جان..... یہی کہ ہماری سوسائٹی میں عورت واقعی کتنی بے چاری اور Dpending ہے..... وراثت میں حصے دار وہ بھی 1/8..... یعنی بیوہ کی حیثیت میں مگر اس کی اپنی ذاتی رہائش گاہ نہیں ہوتی..... باپ کا گھر، شوہر کا گھر، بیٹے کا گھر، پوتے کا گھر ہر وقت بلیک میل کی جاتی ہے چھپر چھاؤں کی خاطر..... یہاں تو اولڈ ہاؤسز بھی نہیں ہوتے کہ خوار کرنے والا بڑھاپا نازل ہو تو رشتوں کے احسان سے جان چھڑا کر وہاں پناہ لے لیں..... نغمانہ اپنی دھن میں بولتی چلی گئی۔ خالدہ بیگم ہکا بکا سی اس کی صورت تکنے لگیں..... بزرگوں میں بیٹھ بیٹھ کر وقت سے پہلے بزرگی آ گئی ہے تم میں..... وہ سنبھل کر مسکرائیں..... نہیں امی جان..... واقعی مجھے انو بوا پر ترس آ گیا..... لڑائی کے آخر میں کہنے لگی تمھارے بیٹے کے در پہ پڑی ہوئی ہوں..... اور رونے لگیں..... نغمانہ اداسی سے بولی.....

اوہ اچھا..... روئی بھی تھیں انو بوا..... بس میں سمجھ گئی لماں کسی کونے میں ان کو بٹھائے ان کے آنسو پونچھ رہی ہوں گی..... یہی ہوتا ہے دونوں آپس میں لڑتی رہتی ہیں مگر ایک دوسری کے آنسو نہیں دیکھ سکتیں..... تب ہی یہ گاڑی یہاں تک پہنچ بھی گئی..... لڑنے سے باز نہیں آتیں مگر ایک دوسرے کے بغیر رہ بھی نہیں سکتیں..... خالدہ بیگم ہنستے ہوئے نغمانہ کا پکایا کھانا چیک کرنے لگیں.....

ابھی مٹر ٹھیک سے گلے نہیں ہیں نغمانہ..... دس منٹ دم پہ رہنے دو..... میں ذرا

کپڑے بدل لوں تو آتی ہوں..... کل تمہارا پیپر ہے تم اپنی تیاری کرو..... امی تو بہت روک رہی تھیں کہ رات کو مشاہد چھوڑ آئے گا..... میں نے کہا غمانہ کا پیپر ہے صبح اس کو تیاری کرنا ہوگی..... اب تم اُلٹی سیدھی سوچوں سے اپنا دماغ نہ تھکاؤ..... بڑھاپے میں سب ایسے ہی ہو جاتے ہیں..... وہ اس کے شانے پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر محبت سے بولیں..... یہ الٹی سیدھی سوچیں نہیں ہیں امی جان..... ایک حقیقت ایک جیتا جاگتا احساس ہے..... ایگزام کے بعد میں ابو سے اجازت لے کر کوئی اچھی سی جاب تلاش کروں گی اور کوشش کروں گی کہ اپنا چھوٹا سا گھر بناؤں..... اپنا گھر..... میرا اپنا..... پہلے میں سوچتی تھی کہ جاب کروں گی اچھے اچھے کپڑے جوتے جیولری خریدا کروں گی..... مگر امی یہ تو بہت بچگانہ سا شوق ہے..... فضول میں پیسہ ضائع کرنا..... محبت ہی کرنا ہے تو ایسی چیز کے لیے کیوں نہ کریں جس میں پائیداری ہو..... وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی..... لاحول ولا قوۃ..... بے وقوف نہیں تو..... تیرا گھر تو وہ ہوگا جہاں تیری شادی ہوگی تیرے میاں کا گھر..... وہ اس کے سر پر پیار سے چپت لگا کر بولیں.....

ہوں..... وہ میاں کا گھر ہوگا میرا نہیں..... امی جان شادی کے بعد طلاق بھی تو ہو جاتی ہے..... میاں کا گھر پھر غیر کا گھر بن جاتا ہے۔

اللہ نہ کرے..... اچھی بات منہ سے نکالو..... اچھا سوچو..... وہ تو سنا ہی ہے کہ جیسی نیت ویسی مراد بیٹا..... اچھا سوچنے سے گرہ سے کچھ جاتا ہے کیا؟ خالدہ بیگم نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا..... ایک ذرا اپنی دادیوں کی بحث وتکرار کیا دیکھ سُن لی جانے کیا اناپ شناپ سوچنے لگیں..... بیٹا یہ تمہارے کھیلنے کھانے کے دن ہیں..... ہنسو کھیلو..... انھوں نے سمجھایا.....

امی جان..... جہاں خواب بننے اور ارمان پالنے سے بھی خوف آتا ہو..... ایسے ہینڈ ٹو ماؤتھ گھرانوں کے بچے تو بچپن ہی میں بوڑھے ہو جاتے ہیں..... میں جاب تو ضرور کروں گی امی جان میں کھل کر خوش ہونا چاہتی ہوں۔ اپنی محنت اور اپنے بہت سے سہمے ہوئے خوابوں کی تعبیر کے لیے اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں..... آج کل تو خواتین ہر میدان میں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ صرف ہمارے ہاں ہی ہوتا ہے کہ ایک کھاتا ہے اور دس کماتے ہیں..... ہر انسان کو اپنی صلاحیت کے مطابق کوشش کرنا چاہیے کہ وہ کسی پر بوجھ نہ بنے آخر جس پر سب اپنا اپنا بوجھ لادتے ہیں وہ بھی تو انسان ہوتا ہے..... اس کا بھی

احساس کرنا چاہیے.....

وہ بڑی دلسوزی سے کہہ رہی تھی.....

خالدہ بیگم نے اس کی پیشانی چوم لی.....

جیتی رہو..... یہ بھی احساسِ ذمہ داری اور روشن ضمیری کی علامت ہے کہ انسان دوسروں کو اپنی ذات سے تکلیف دینا پسند نہ کرے..... اگر تم کوئی ہینڈسم جاب کرنا چاہو گی تو تمہارے ابو تمہیں کبھی منع نہیں کریں گے..... اور تم جیسی بچیوں کو جن میں احساسِ ذمہ داری موجود ہو ترقی کے راستے پر چلنے سے نہیں روکنا چاہیے..... کام کرنے کی لگن بھی بہت اچھی بات ہے خواہ مرد ہو یا عورت میں..... میں تو خود تمہارے ابو کا ہاتھ بٹانا چاہتی تھی مگر انہوں نے صرف اس لیے منع کیا کہ تم چاروں میں گیپ کم ہے..... کہنے لگے تم گھر سے باہر رہو گی تو بچے متاثر ہوں گے اور بچوں کی تربیت میں ہی کمی رہ گئی تو روپے کی زیادتی ہمیں کیا خوشی دے سکے گی.....؟ میں نے اصرار نہیں کیا..... بلکہ جیسے جیسے تم لوگ بڑے ہوتے گئے تمہارے ابو مزید مصروف ہوتے گئے گورنمنٹ جاب کے ساتھ پرائیویٹ کمپنی میں بھی بحیثیت اسٹینو گرافر کام کیا پوش علاقوں میں ٹیوشن بھی دی..... غرض کے انہوں نے کوشش کی بچوں کو بنیادی ضروریات میں کبھی کسی کمی کا احساس نہ ہو..... خالدہ بیگم جیسے دور پہنائیوں میں کچھ تلاش کرتے ہوئے بول رہی تھیں..... غمانہ بہت توجہ سے سُن بھی رہی تھی اور کچھ تانے بانے بھی بن رہی تھی۔

.....✿.....

شانی..... اے بیٹا..... یہ بیس روپے ہیں جا جا کر ذرا تھوڑی سی بالوشاہی تو لے آ..... تیرے دادا آئے تھے رات کو خواب میں..... اداس دکھائی دے رہے تھے..... عصر مغرب کے درمیان فاتحہ دلاؤں گی..... ذرا مولوی صاحب کو بھی ٹوکتا جائیو..... انو بوا نے مڑے تڑے دس دس کے دو نوٹ شانی کو تھما کر ذرا پکار کر کہا.....

بیس روپے کی بالوشاہی.....؟ کس زمانے کی بات کر رہی ہیں انو بوا آپ..... بیس روپے کی بالوشاہی تو مولوی صاحب ہی کھا جائیں گے..... کل دادا آپ کو اداس نظر آئے تھے آج کے خواب میں تو روتے ہوئے آئیں گے کہ انوری بیگم میری بالوشاہی کدھر ہے؟ اے تو کیا نذر منت چڑھا رہی ہوں؟ فاتحہ ہی تو ہے ذرا سی میٹھی چیز پر ہو جاتی ہے.....

میرے کنے اتے پیسے نہیں ہوتے..... خوب پتہ ہے تیرے دادا کو کہ ترکہ میں کیا چھوڑ گئے ہیں..... انو بوا جل کر بولیں.....

سدا کی ناشکری ہو انو بیگم تم..... کتنا تو خیال کرتے تھے تمہارا..... اب یہ تو تمھارے اماں ابا کو چاہیے تھا کہ ڈھونڈتے تمھارے لیے زمین جاگیر والا بَر صابرہ دادی جانے کیا ''کشیدہ کاری'' لیے بیٹھی تھیں ٹانکا لگاتے لگاتے جل کر بولیں..... نہیں..... نہیں..... آج جنگ نہیں آج دادا غلام حسین کی فاتحہ ہے..... فرحانہ جانے کس کونے سے نکل آئی تھی..... ہاتھ پھیلا کر یوں بولی جیسے حملہ آوروں کو روک رہی ہو جب دادا کی زندگی میں جنگ پر پابندی نہیں تھی تو ان کے بعد تم کون ہوتی ہو جنگ پر پابندی لگانے والی.....؟ شانی نے فرحانہ کو لتاڑا.....

بری بات ہوتی ہے فاتحہ اچھے ماحول میں ہونا چاہیے..... فرحانہ بجائے چڑنے کے بہت سکون سے بولی..... شانی سے سال بھر بڑی تھی مگر ''تعلقات'' برابری کی بنیاد پر تھے اے کونسا جنگ ہو رہی ہے..... تم لوگ بڑوں کے بیچ میں کیوں بولتے ہو..... اتنی لمبی ڈگری ہے تمہاری ماں کے پاس.....؟ یہ سیکھ دی ہے اس نے تمھیں..... انو بوا نے کہیں کا غصہ کہیں نکالنے کی کوشش کی..... یعنی گدھے کے کان اینٹھے..... اے تم کیا ہاتھ دھو کر میرے بچوں کے پیچھے پڑ گئیں..... اور خبردار جو میری بہو کو کچھ کہا..... میری بہو کی تو مثال ہی نہیں کوئی..... صابرہ دادی نے پھر انو بوا کے لتے لیے.....

تو اور کیا..... لوگ ایک ''ساس'' افورڈ نہیں کر سکتے..... میری امی دو ساسوں کے ساتھ امن سے رہتی ہیں..... شانی اتنا کہہ کر منہ پھاڑ کر ہنسا.....

ذرا منہ کم کھول کر ہنسا کرو..... آکسیجن کم ہو جاتی ہے..... فرحانہ نے پھر شانی کے پن چبھوئی.....

ارے وہ تمہاری بہو بیگم ہیں کہاں؟ یہ نہیں کہ بچوں کو لگام ڈالیں..... جانے کس کونے میں کان دبائے بیٹھی ہیں..... انو بوا سُلگ کر بولیں.....

انو بوا تم تو بالکل ہی سٹھیا گئی ہو..... ابھی کچھ دیر پہلے تمھارے سامنے ہی تو گئی ہے گوشت سبزی لینے..... یہ بچے تو مار دو سو تین سو میں چھپڑے اٹھالاتے ہیں اس لیے یہ کام بھی اس کو ہی کرنا ہوتا ہے..... کوئی ایک فکر ہے اسے..... صابرہ دادی نے پھر بہو کی

طرف داری میں کلمات ادا کیے.....

دادی آپ نے سارا مزہ خراب کر دیا بالوشاہی کا..... اوپر دادا انتظار کر رہے ہوں گے کہ ابھی تک اگربتی اور بالوشاہی کی خوشبو نہیں آئی..... شانی نے پھر بھونڈے پن سے قہقہہ لگایا.....

اُف..... کیا آج بالوشاہی بٹ رہی ہے..... نغمانہ لیدر کا سیاہ بیگ شانے سے اتارتی برآمدے میں نمودار ہوئی تھی.....

لو..... یہ بھی پہنچ گئیں..... اب ان کی مل کر قوالی ہوگی..... ماں باپ پر تو پڑے ہی نہیں عارف حسین کے بچے..... گز گز بھر کی زبانیں ہیں منہ میں۔ انو بوا بڑبڑائیں آپی سے تعلقات اچھے رکھنے کی کوشش کیجئے انو بوا..... بڑی اچھی جاب ملنے والی ہے..... پورا ٹوکرا منگا دیا کریں گی بالوشاہی کا فاتحہ والے دن۔ ساتھ بریانی کی دیگ بھی..... شانی نے پھر انو بوا کو تنگ کیا.....

اے ہٹاؤ..... کیا حالت بنالی ہے اس نے اپنی..... یوں جوتیاں چٹخاتی پھر رہی ہے نوکری کے لیے کہ جیسے کوئی بے روزگار بال بچوں والا مارا مارا پھرتا ہے..... اچھا بھلا صاف رنگ کالا پڑتا جا رہا ہے..... اس عمر میں ہی بَر ڈھونڈنا ہوتا ہے اور یہ اپنا حلیہ بگاڑ رہی ہے..... ''فرحانہ'' مجھے ''بالوشاہی'' کی کہانی سناؤ..... نغمانہ دھپ سے کین کی کرسی پر گر گئی اور فرحانہ سے شرارت بھرے انداز میں بولی.....

کہانی یوں ہے آپی کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کسی گاؤں میں انو بوا رہتی تھیں ایک دن ان کی شادی دادا غلام حسین سے ہوگئی..... ان کے دو تین بچے تھے..... مگر اتفاق سے دادا غلام حسین انو بوا سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور ان کی فاتحہ انو بوا کے ذمے لگ گئی..... ذرا سی تاخیر ہو جائے تو انو بوا کے خواب میں اداس اداس سے چلے آتے ہیں..... اب یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ فاتحہ میں تاخیر کی وجہ سے اداس ہوتے ہیں یا انو بوا کی جدائی کی وجہ سے مغموم ہوتے ہیں..... فرحانہ نے مسکرا کر کن انکھیوں سے انو بوا کا چہرہ دیکھا..... جو جھک کر چپل تلاش کر رہی تھیں..... یہ دیکھتے ہی فرحانہ وہاں سے پھوٹ لی..... شانی بھی مٹھی میں بیس روپے دبائے باہر کی طرف چلا.....

تو کدھر جا رہا ہے شانی؟ صابرہ دادی نے اپنی عینک کے عدسوں کے پیچھے سے

پوتے کو گھورا.....

بالو شاہی لینے دادی جان..... شانی نے شرارت سے انو بوا کی طرف دیکھ کر کہا..... چل تو انو بوا کو بیس روپے واپس کر اس بے چاری کے پاس کہاں ہوتے ہیں روپے پیسے بیٹا تو ہے ہی ناخلف..... کونسا ماں کے ہاتھ پر کچھ رکھتا ہے..... مجھے تو عارف حسین ماہانہ دیتے ہیں..... میں اٹھا رکھتی ہوں میں نے کون سا خریداری کرنا ہوتی ہے۔ یہ لے دو سو روپے دو سیر مٹھائی لے آ..... پڑوس میں بھی دینا اور خود بھی کھانا اور اپنے دادا کو دعا دینا..... صابرہ دادی نے اپنا پاندان کھولا اور دو سو نکال کر شانی کے ہاتھ پر رکھ دیے اور نغمانہ نے مسکرا کر اپنا سر تھام لیا.....

.....✿.....

ابو..... دس جگہ انٹرویو دے چکی ہوں..... اٹھتی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ یہ جاب تو مجھے ضرور مل جائے گی..... مگر.....؟ نغمانہ رات کھانے کے بعد باپ سے آدھ گھنٹہ، گھنٹہ باتیں ضرور کرتی تھی..... وہ اپنی دن بھر کی رپورٹ سناتے..... وہ اپنی کارگزاریاں سناتی۔ یہ فرینڈ شپ دونوں ہی کو فریش رکھتی تھی..... آج عارف حسین کے کچھ ملنے والے آ گئے تھے۔ اس لیے آج ذرا دیر سے میٹنگ ہوئی تھی.....

ایسا ہی ہوتا ہے بیٹے..... آج کل تو بڑے بڑے کوالیفائڈ لوگ جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں..... یہ تو نصیب کی بات ہوتی ہے..... اور ''پرچیوں'' نے تو اچھے اچھے بچوں کو کامپلیکسڈ کر دیا ہے..... جب تک سسٹم تبدیل نہیں ہوگا۔ مستحق اسی طرح دل برداشتہ نظر آئے گا..... مگر ایمان کی قوت سے بڑی کوئی پاور نہیں..... ہمت نہیں ہارنا چاہیے..... اللہ چاہے تو بہت کچھ ناممکن ممکن ہو جاتا ہے۔ جب اللہ کی موجودگی پر یقین واثق ہے تو دل چھوٹا کرنا کیا معنی.....؟ بدی کی کثرت سہی مگر نیکی کا نور کہیں نہ کہیں جھلک رہا ہوتا ہے..... انشاء اللہ..... تمہارا کام ضرور بنے گا..... مجھے پتہ ہے میری بیٹی بہت باصلاحیت ہے عارف حسین نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت وشفقت سے لبریز لہجے میں اس کے اندر امنگ پیدا کرنے کی کوشش کی.....

ہمت تو خیر میں نہیں ہاروں گی ابو..... میرے خوابوں میں بہت زندگی اور قوت ہے۔ نغمانہ نے مضبوط لہجے میں کہا.....

شاباش..... عارف حسین نے اس کی پیٹھ تھپکی.....

صابرہ دادی جائے نماز پر بیٹھی تھیں تسبیح ہاتھ میں تھی مگر بے چینی سے پہلو بدل رہی تھیں عارف حسین کی ''شاباش'' کے ساتھ ہی انھوں نے تسبیح چوم کر سجدے کی جگہ رکھی اور پلٹ کر تخت پر بیٹھے باپ بیٹی پر ایک نگاہ ڈالی.....

عارف میاں، یہ کیا لونڈیا کو لونڈوں والے سبق پڑھا رہے ہو۔ اس کو اپنے گھر کی کرنے کی فکر کرو..... کمشنر کلکٹر بن جائے ہے تو عورت ذات..... اور عورت ذات کو گھر کے جھمیلے بہت..... وہ بہت ناراض انداز میں گویا ہوئی تھیں.....

اماں..... وقت بہت بدل گیا ہے..... عورت فوج میں جا رہی ہے، جہاز اُڑا رہی ہے..... ملک کی باگ ڈور چلا رہی ہے..... وہ عورت جو بہت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو اسے دیہاتی عورت کی طرح روٹیاں پکانے اور بچے سنبھالنے تک محدود کرنا بہت زیادتی ہے کوئی کچھ کرنا چاہتا ہو تو اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالنا چاہیے۔ خواہ عورت ہو یا مرد..... عارف حسین نے مودبانہ انداز میں ماں کو جواب دیا.....

اگر عورت یہ بھی کرے گی اور گھر بار بھی کرے گی تو دوہری پسے گی..... عورت کی شان اس کے گھر بار سے ہوتی ہے..... نوکری سے نہیں..... صابرہ دادی نے اسی بگڑنے موڈ میں جواب دیا.....

ماں..... یہ تو آپ بھی بہت اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ دوسروں پر انحصار نہ کرنے والوں کی سب لوگ ہی عزت کرتے ہیں اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ اگر یہ کچھ کرنا چاہتی ہے تو کرنے دیں..... اچھا رشتہ آ گیا تو شادی بھی کر دیں گے جو بہرحال کرنا ہی ہے۔ عارف حسین نے ماں کو مطمئن کرنے کی سعی کی.....

اچھے رشتے کہاں آئیں گے پھر تو لالچی ہی آئیں گے رال ٹپکاتے ہوئے کہ چلو کمانے والی آئے گی تو بہتی گنگا میں ہم بھی ہاتھ دھوئیں گے..... صابرہ دادی جل کر بولی تھیں آپ کی بات کو غلط نہیں کہا جا سکتا اماں..... اس لیے کہ سیانوں نے کہا ہے۔ قیمتی پتھر اور آدمی کی شناخت کرنا بہت مشکل کام ہے..... پھر بھی اندازہ تو ہو جاتا ہے..... اور پھر اماں ساری بات مقدر کی..... جو لڑکیاں پڑھی لکھی نہیں ہوتیں برسرِ روزگار نہیں ہوتیں مکمل گھر داری کرتی ہیں۔ شادیاں تو ان کی بھی ناکام ہو جاتی ہیں..... شوہر بھی نکمے مل جاتے

ہیں..... یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ میاں بیوی دونوں ملازمت پیشہ ہیں اور گھر بھی بہت اچھی طرح چلا رہے ہیں..... آپ بس اس کے اچھے نصیب کی دعا کرتے رہیے..... میں نے اس میں امنگ وصلاحیت دیکھی ہے..... زندگی کا جوش دیکھا ہے میں چاہتا ہوں یہ اس دنیا سے جو لینا چاہتی ہے اس کی کوشش کرے اور کامیابیوں کی خوشیاں محسوس کرتی رہے۔ مجھے ذرہ برابر اس بات کا لالچ نہیں ہے کہ یہ بیٹا بن کر میرا ہاتھ بٹائے یا اپنا جہیز اکٹھا کرے۔ اللہ نے مجھ پر اولاد کی جو ذمہ داری ڈالی ہے..... وہ تو میں پوری کروں گا..... انشاء اللہ۔ عارف حسین نے حتی الامکان کوشش کی کہ ماں کو اپنے حق میں کر کے پرسکون کر دیں..... اور ان کی یہ کوشش بے کار بھی نہیں گئی.....

لماں نے تسبیح اٹھائی اور جائے نماز کا کونہ تھام کر اُٹھ کھڑی ہوئیں اور بولیں..... جیسے تم بہتر سمجھتے ہو کرو..... بڑے بوڑھے تو اپنے تجربہ کی بنیاد پر صلاح دے دیتے ہیں۔

.....✿.....

کئی ماہ کی بھاگ دوڑ کا بڑا خوشگوار نتیجہ نکل آیا تھا نغمانہ کو ایک بڑی انشورنس کمپنی میں اِن ڈور جاب مل گئی تھی۔ آفس ورک تھا اور آگے بڑھنے کے مواقع موجود تھے..... کمپیوٹر پر مہارت اور آئی ٹی کا ڈپلومہ اس کے بڑا کام آیا..... دراز قامت، خوش شکل وخود اعتماد تو وہ تھی مقصد میں کامیابی پا کر چہرہ اور نکھر گیا تھا خوشی کی چمک کا ایک نرالا رنگ ہوا کرتا ہے جو عام سے چہرے کو بھی دلکش بنا دیتا ہے.....

اس نے ماں سے کچھ رقم ادھار لے کر کہ تنخواہ ملنے پر واپس کر دے گی اپنے دو چار نئے سوٹ سلوا لیے تھے اور ذرا اچھا سا ہینڈ بیگ لے لیا تھا..... عموماً شام چھ بجے تک اس کی واپسی ہوتی تھی کمپنی کی کوسٹر ہی اس کو ڈراپ کرتی تھی..... پھنچ کر کے وہ دونوں دادیوں سمیت گھر والوں کے ساتھ چائے پیتی اور ان کی کمپنی انجوائے کرتی..... ٹی۔ وی پروگرام دیکھے جاتے، رات کا کھانا اور نماز سے فارغ ہو کر وہ معمول کے مطابق باپ کے پاس بیٹھتی اور دن بھر کے واقعات وکارگزاری گوش گزار کرتی..... رات گیارہ بجے سو جاتی صبح اذان کے وقت بیدار ہو جاتی گھر کے کام میں اب وہ ہاتھ نہ بٹا پاتی تھی البتہ چھٹی والے روز وہ سب گھر والوں کے کپڑے مشین لگا کر دھو دیا کرتی..... یوں بھی دو بزرگ خواتین کی موجودگی میں کام کا مسئلہ نہیں تھا اس گھر میں..... گوشت آتا تو دونوں میں سے

ایک صاف کر کے دھو کے خالدہ بیگم کے حوالے کر دیتی۔ سبزیاں چھیلنے کاٹنے اور دھونے کا کام خالدہ بیگم نے کبھی نہیں کیا تھا یہ کام شروع سے ان کی ساسیں کر رہی تھیں..... دالیں چاول تک دونوں عینکیں چڑھا کر صاف کر دیا کرتی تھیں کئی قسم کی چٹنیاں گھر میں ہمیشہ موجود رہتی تھیں جو وہ دونوں سِل پر پیسا کرتی تھیں..... آئے روز ہاون دستے میں کچھ نہ کچھ کوٹا جاتا..... خالدہ بیگم بہتیرا کہتیں لماں آج کل تو مشینوں سے یہ سب کام منٹوں میں ہو جاتے ہیں مگر وہ اپنی روایات سے ہٹنا پسند نہ کرتیں.....

گھر میں کوئی ملازم نہیں تھا اور نہ عارف حسین ملازم یا ملازمہ افورڈ کر سکتے تھے۔ گھر میں ایک لگا بندھا نظام چلتا آ رہا تھا تمام کام خوش اسلوبی سے ہو جاتے تھے..... بلکہ تینوں ساس بہو کو نغمانہ فرحانہ کی ہیلپ کی ضرورت بھی نہیں تھی بس وہ اس خیال سے ساتھ لگا کر رکھتی تھیں کہ ان کو گھریلو کاموں کی سوجھ بوجھ ہو اور اپنے اپنے گھر جا کر اپنی ذمہ داریاں اچھی طرح ادا کریں بہرحال دونوں لڑکیوں کو گھر کے کاموں کا ٹینشن نہیں تھا اس لیے نغمانہ کو اپنے آفس میں اپنی صلاحیتیں دکھانے کا بھرپور جذبہ میسّر تھا..... اس کے باسز اس سے خوش اور اپنے انتخاب پر مطمئن تھے.....

وہ نئے ڈگر پر بڑی اچھی طرح چل پڑی تھی..... اور آنے والے مہینے کا شدت سے انتظار کر رہی تھی جب اسے پورے سات ہزار روپے تنخواہ ملنا تھی.....

وہ روز رات کو سونے سے پہلے بہت خوبصورت خواب دیکھتی..... سب سے پہلے تو وہ دو چار اچھے سوٹ سلوائے گی اور گھر والوں کے لیے گفٹ لائے گی.....

پھر دوسرے مہینے سے ڈرائنگ روم میں کچھ ضروری تبدیلیاں کرے گی..... ڈرائنگ روم ڈھنگ سے سیٹ ہو جائے گا تو کچن میں کچھ کام کرائے گی تاکہ وہاں کام کرنے میں سہولت رہے پھر گھر کے اکلوتے واش روم کا حلیہ درست کرے گی..... واش روم اچھا ہو تو نہانے دھونے کے خیال ہی سے خوشی محسوس ہونے لگتی ہے..... اس سال سردیوں میں گیزر تو ضرور لگوائے گی صبح آنکھ کھلتے ہی پانی گرم کرنے کی ٹینشن ہو جاتی ہے..... ہر سال پروگرام بنتا تھا مگر صرف فٹنگ پر ہی اتنا خرچہ بتایا تھا کہ عارف حسین یہ کام ملتوی کر دیتے تھے کہ اسی دوران کسی نہ کسی بچے کی فیس جمع کرانے کا مرحلہ آ جاتا تھا..... پھر یہ ضروری کام ہو جائیں گے تو وہ ایک فلیٹ یا اپارٹمنٹ بک کرائے گی..... اس وقت تک اس

کی سیلری بھی بڑھ جائے گی اور وہ تین چار ہزار روپیہ مہینہ بچت کر لیا کرے گی..... اپنا گھر.....؟ اُف کتنا خوبصورت احساس ہے..... وہ آنکھیں موند کر سوچتی اور اس حسین سپنے کے ساتھ ہی گہری نیند میں ڈوب جاتی.....

پہلی تنخواہ ملتے ہی اس نے کپڑوں کی شاپنگ کی..... کچھ اپنے کپڑے ایک ایک سوٹ دونوں دادیوں کا اور ایک ماں کا..... فرحانہ کے پاس ریسٹ واچ نہیں تھی اس کے لیے درمیانے قسم کی خوبصورت سی ریسٹ واچ لی..... شانی بہت دنوں سے باپ سے کٹ بیگ کی فرمائش کر رہا تھا اس کے لیے کرکٹ کٹ بیگ لیا..... وقار کے لیے دو ٹی شرٹس لیں..... اور بہت خوش خوش گھر میں داخل ہوئی..... جیسے عید کا دن ہو۔ سب سے پہلے دادیوں کو کپڑے دیے وہ دونوں چند تانے مبہوت سی اس کی صورت تکتی رہ گئیں اے بچی..... ہم بوڑھوں پر اتنا خرچہ کاہے کیا..... وہ جو دھرے ہیں وہ برتنے کو بہت..... انو بوا نے قدرے شرمسار سا ہو کر کہا تھا.....

کوئی زیادہ مہنگا نہیں ہے انو بوا..... یہ بتائیں پسند آیا..... اس نے پُرمسرت لہجے میں پوچھا.....

زیادہ مہنگا نہیں تو کیا ہوا..... پیسوں کا تو آیا ہے..... اتی جان کاری کر رہی ہو تو اپنے دان دہیز کے واسطے جوڑ رکھو..... وہ کپڑا پھیلا کر دیکھتے ہوئے بولیں..... کوئی بات نہیں انو بوا..... خوشی سے لائی ہے قبول کریں اور دعا دیں..... خالدہ بیگم بھی بہت خوش نظر آ رہی تھیں.....

اس نے کچھ پیسے ماں کے ہاتھ پر رکھے تو وہ اس کی پیشانی چوم کر بولیں.....

تمھارے لیے ہی اٹھا رکھوں گی..... اللہ تمھارے باپ کو سلامت رکھے ہم لوگوں کے لیے اتنی محنت کر لیتے ہیں کہ اچھی گزر بسر ہو جاتی ہے.....

شانی اپنا کٹ بیگ دیکھ کر اور فرحانہ ریسٹ واچ دیکھ کر بہت خوش ہوئی وقار کو ٹی شرٹس بہت پسند آئیں اس نے شکریہ ادا کیا.....

بتاؤ..... سگا بیٹا تو سال میں دو پٹہ نہیں لے کر دیتا جیسے عارف حسین نے جنم جنم کا ٹھیکہ لیا تھا میرا اور پوتی اتنا خوبصورت سوٹ لائی ہے..... بڑی شان ہے مولا تیری انو بوا آسمان کی طرف تکتے ہوئے بولیں.....

اے ہٹاؤ بھی انو بوا ہر وقت بیٹے کا رونا..... غریب بچہ ہے بال بچوں کا ساتھ ہے صابرہ دادی نے ماتھے پر بل ڈال کر انو بوا کو ٹوکا.....

بھابی..... تمھارے دل کو نہیں لگی ایسی جو میرے جی کو لگی ہے..... تمھیں اللہ نے سعادت مند بیٹا دیا ہے..... اس کا غرور ہے تمھیں..... انو بوا بھی چیخ کر بولیں.....

اے خبردار..... مجھے کوئی غرور ودور نہیں اللہ کی امانت ہے..... اللہ جیتا رکھے۔ تمھارے اپنے مزاج کا قصور ہے جو تمہاری بہو سے نہیں بنتی..... صابرہ دادی نے پھر اپنی ازلی صاف گوئی سے انو بوا کی خبر لی.....

میرا مزاج.....؟ اے تو کیا پاؤں دابوں بہو کے..... پانچ بچوں کی چھلا چھپائی نہیں کی؟ وہ ہے ہی نمک حرام..... مطلب نکلتے ہی آنکھ پھیر لیتی ہے..... تمہارا مزاج کونسا بھلا ہے وہ تو نصیب سے تمھیں بہو اچھی ملی ہے..... منہ میں زبان نہیں ہے اور تمہاری اچھی گزر بسر ہو رہی ہے..... ہماری ماں سے تو تمہاری ایک دن نہیں بنی..... انو بوا نے بھی صابرہ دادی کو آڑے ہاتھوں لیا.....

تو تم اپنی اماں ہی پر تو پڑی ہو..... ذرا رسانیت نہیں تھی اللہ بخشے ہماری ساس میں۔ ہاں..... اب تم میری مری ماں کے پیچھے پڑ جاؤ..... انو بوا سخت بُرا مان کر بولیں..... بات تم نے نکالی ہے..... ڈھنگ طریقے کا بولو تو کیوں کسی سے چار بات سنو..... صابرہ دادی تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ پیچھے ہٹتیں.....

دیکھ رہی ہو دلہن اپنی ساس کو.....؟ انو بوا کو کچھ نہ سوجھا تو خالدہ بیگم سے فریاد کی چھوڑیں اماں..... خوشی کا موقع ہے..... بچی خوش خوش گھر آئی ہے.....

خالدہ بیگم نے جھگڑا رفع دفع کرنے کی کوشش کی.....

یہ تو تم بولو دلہن مرے ہوئے کو تو برا بھلا نہیں کہنا چاہیے؟ ایمان کی بولو..... انو بوا مصر ہوئیں ارے ہم تو زندہ کو نہیں بولتے تھے..... گن کر روٹی آگے دھرتی تھیں تمہاری ماں آدھا پیٹ کھا کر اٹھتے تھے سارے خاندان کی چاکری کرتے تھے مگر کبھی ساس کی چغل خوری نہیں کی اپنے نصیب پر صبر کیا..... صابرہ دادی کے تیور بہت سخت ہو چکے تھے..... آخر انو بوا ان کی بہو کی حمایت حاصل کرنے کے درپے ہو چکی تھیں.....

یہ مسئلہ فلسطین ہے کبھی حل نہیں ہوگا..... آپ لوگ ایسا کریں اپنا اپنا کام شروع

کریں ان دونوں کو اسی طرح مصروف رہنے دیں..... جب بھی ان کا کلیش ہوتا ہے۔ خاندان کی ہسٹری کے نئے باب نوٹس میں آتے ہیں..... نئی جنریشن کی بہت خدمت کر رہی ہیں دونوں..... وقار نے اتنا کہہ کر اپنی ٹی شرٹس اٹھا کر دوڑنے کی سوچی..... دیکھو کتنا ہوشیار ہے..... یہ لونڈا..... انگریزی میں ہمیں برا بھلا کہہ رہا ہے۔ انو بوا نے برافروختہ ہو کر خالدہ بیگم سے شکایت کی.....

بری بات ہے وکی..... خالدہ بیگم نے تنبیہ کی.....

ٹھیک تو کہہ رہے ہیں وقار بھائی..... وہ تو انگریزی میں آپ دونوں کی تعریف کر رہے ہیں اور آپ بُرا مان رہی ہیں..... شانی نے وقار کی طرف دیکھ کر ایک آنکھ دبائی اور ہنسا..... اے لو..... صابرہ بیگم کا پوتا میری کیوں تعریف کرنے لگا.....؟ انو بوا نے بے یقینی سے کہا۔ ہاں..... اسی صابرہ بیگم کا بیٹا تمھیں ماں برابر سمجھتا ہے..... صابرہ دادی جل کر بولیں ہاں تو اپنے باپ پر پڑا ہے..... اللہ بخشے زمانہ آج تک تعریف کرتا ہے میرے بھائی کی..... بڑے دل کا کھلے ہاتھ کا..... اس کے جیتے جی کبھی چولہا ٹھنڈا نہیں ہوا..... دو چار باہر کے دسترخوان پر ہمیشہ ہوتے تھے..... انو بوا نے بڑے فخریہ انداز میں کہا.....

ابے بیوی..... تو تم لوگ ہمارے در پر آئے کیوں تھے؟ ہم خود آ کر بیٹھ گئے تھے تمھارے گھر میں..... ایسے ہی کیڑے پڑے ہوئے تھے ہم میں..... میں نے تو سنا ہے تمھارے ماں کے مزاج کی وجہ سے تمھیں کوئی اپنی بیٹی دیتا ہی نہیں تھا..... وہ تو میرے ابا سیدھے تھے آ گئے تم لوگوں کے چکر میں..... صابرہ دادی نے غضب ناک لہجے میں کہا.....

..... رے..... اماں..... بس ناں..... چھوڑیں بھی..... کیا رکھا ہوتا ہے پچھلی باتوں میں کیوں جان جلاتی ہیں گڑے مردے اکھیڑ کر..... بس پانی پئیں اور غصہ ٹھنڈا کریں..... عارف بھی آتے ہوں گے..... نماز کا وقت ہو چلا ہے نماز کے بعد میں کھانا لگاتی ہوں..... اتنے مزے کی کڑھی بنی ہے بس آپ کھائیں گی تو مزہ آ جائے گا..... کڑی پتہ ختم ہو گیا تھا بہت ڈھونڈ کر لائی ہوں کڑی پتے کے بگھار کے بغیر تو کڑھی ادھوری رہتی ہے.....

چلو بچوں نماز کی تیاری کرو..... فرحانہ سنک میں کچھ برتن پڑے ہیں دھو ڈالو..... خالدہ بیگم یوں گویا ہوئیں کہ درمیان میں سانس نہ لی مبادا دقفے کا فائدہ اٹھا کر دونوں میں سے پھر کوئی شروع ہو جائے.....

نغمانہ دھیرے دھیرے اپنے سوچے ہوئے پروگرام پر مرحلہ وار عمل درآمد کر رہی تھی اور سات آٹھ مہینوں میں گھر میں بہت سی اچھی تبدیلیاں نمایاں نظر آنے لگی تھیں..... کچن اور واش روم بھی جدید انداز میں ڈھل چکے تھے..... ڈرائنگ روم میں پرنٹڈ کارپٹ اور میچنگ کرٹن نظر آ رہے تھے کچھ خوبصورت ڈیکوریشن پیسز کا بھی اضافہ ہو چکا تھا..... عارف حسین نے خالدہ بیگم کو سختی سے کہہ دیا تھا کہ وہ جو کر رہی ہے اسے کرنے دو ٹوکو نہیں..... ہم اگر اس کے خوابوں کی تکمیل سے معذور تھے تو اسے اپنی محنت سے خوشیاں حاصل کرنے دو..... لہٰذا خالدہ بیگم بہت سی چیزوں کو فضول خرچی کے زمرے میں سمجھتے ہوئے بھی خاموش رہتی تھیں..... گھر میں بہت سی سہولتوں میں اضافہ ہوا تھا سب سے زیادہ خوش خالدہ بیگم اس لیے تھیں کہ گھر میں گرم پانی کی سہولت ہو گئی تھی اور گھر کے روزمرہ امور انجام دینا ہلکا لگنے لگا تھا..... کیونکہ انھیں اپنی ساسوں کے ساتھ منہ اندھیرے بیدار ہونے کی عادت تھی..... صبح کو ٹھنڈے پانی کی وجہ سے ضروری کام کرنے کے بعد انھیں آئے روز نزلہ زکام کی شکایت رہنے لگی تھی..... گرم پانی کی وجہ سے کپڑے بھی زیادہ اچھے دُھلتے تھے.....

خود نغمانہ میں خاصی نمایاں تبدیلی آ چکی تھی..... پارلر سے بال سیٹ کرا لیے تھے جدید فیشن کے ملبوسات پہنتی تھی..... میچنگ جیولری کے ساتھ..... ہینڈ بیگ قیمتی اور اصلی لیدر کا تھا..... ریسٹ واچ قیمتی تھی..... کاسمیٹکس اعلیٰ کوالٹی کی یوز کرتی تھی..... پرفیوم ایسا استعمال کرتی تھی کہ گھر سے جانے کے بعد بھی گھنٹوں گھر مہکتا رہتا تھا..... دونوں دادیوں کو اس کی بہت سی باتوں پر اعتراض ہوتا تھا مگر عارف حسین کی وجہ سے بس بَل کھا کر رہ جاتی تھیں.....

اسے سال میں دو بونس ملنے کی خبر بھی مل چکی تھی..... اس لیے اپارٹمنٹ کی بکنگ اس نے بونس پر اٹھا رکھی تھی.....

بہن بھائیوں کو بھی وہ اکثر نوازتی رہتی تھی جس کی وجہ سے وہ اس کی بہت ماننے لگے تھے اسے دسمبر میں بونس ملنا تھا اس لیے اس نے شہر میں مختلف پروجیکٹس دیکھنا شروع کر دیے تھے..... تاکہ وہ کوئی ایسا اپارٹمنٹ منتخب کر سکے جو اس کی رینج میں آتا ہو اور جس کا قبضہ ملنے میں زیادہ دیر نہ ہو.....

اس نے سوچا تھا..... وہ پانچ کمروں کا اپارٹمنٹ بک کرائے گی اس میں تین واش روم تو لازمی ہوں گے..... گنجائش بھی زیادہ ہو گی..... گھر کو نسا روز روز لیے جاتے ہیں.....

وہ بہت بے چینی سے دسمبر کا انتظار کر رہی تھی..... کہ اس کے دیرینہ خواب کا پہلا مرحلہ شروع ہونا تھا.....

مگر..... چھناک سے کہیں کوئی بلور ٹوٹا اور کرچی کرچی ہو گیا.....

وہ چھٹی کے روز حسب عادت صبح ہی کپڑوں کی دھلائی میں مصروف ہو گئی تھی..... کہ شانی اس کے پاس چلا آیا..... ایک عجیب سی جھجک اس کے انداز میں تھی.....

وہ..... آپی..... آپ سے بہت ضروری بات کرنا ہے..... وہ بولا.....

اے تو کرو ناں..... اتنا کیوں شرما رہے ہو..... کوئی لڑکی وڑکی پسند آ گئی ہے؟ مسکرا کر اسے چھیڑتے ہوئے بولی.....

اے گولی ماریں لڑکی کو..... لڑکیاں بہت..... کوئی مسئلہ نہیں ہے..... پہلے لڑکی حاصل کرنے والا حلیہ تو بنائیں..... اس حال میں تو ''روز میری'' ہی ملے گی اس کا اشارہ باہر گلیوں میں جھاڑو لگانے والی جمعدارنی کی طرف تھا..... اس میں ادائیں بہت تھیں جس کی وجہ سے وقار نے کرسچین ہونے کی وجہ سے اس کا نام ''روز میری'' رکھ چھوڑا تھا ورنہ اصلی نام تو اس کا ''پروین'' تھا.....

نغمانہ کی ہنسی چھوٹ گئی.....

اچھا تو پھر خود ہی بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟

آپی..... ابو چاہتے ہیں کہ میں ایم۔ بی اے کروں..... یا کامرس کی لائن میں رہ کر آئی سی ایم اے کروں..... مگر میں ایم۔ بی اے میں انٹرسٹڈ نہیں ہوں میں بی۔ بی۔ اے کرنا چاہتا ہوں اس میں اسکوپ بہت ہے..... مگر یہ ذرا مہنگا ہے..... پینتالیس پچاس ہزار..... پر سمسٹر پڑے گا..... آپ تو لون وغیرہ لے سکتی ہیں ناں..... لاکھ سوا لاکھ تک تو ابو ارینج کر سکتے ہیں..... باقی..... شاید وہ اسی لیے چاہتے ہیں کہ میں ایم۔ بی۔ اے کروں یہ لاکھ سوا لاکھ تک ہو جائے گا۔ مگر میرا انٹرسٹ ہی نہیں ہے..... وہ بہت آہستہ آواز میں نظریں جھکا کر کہہ رہا تھا.....

نغمانہ نے مشین سے کپڑے نکالنے، نچوڑنے کا عمل ترک کر دیا..... وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی.....

شروع میں تمھیں کتنے پیسے چاہیے ہوں گے.....؟ اس نے کسی دھیان سے

چونک کر شانی سے سوال کیا.....

پر سمسٹر ابو بیس ہزار تک کر دیا کریں گے..... باقی بیس پچیس ہزار کا مسئلہ ہوا کرے گا..... وہ نظریں جھکا کر بولا.....

اس میں سمسٹر فیس، کنوینس، لنچ وغیرہ سب ہی شامل ہیں۔ وہ مزید بولا۔ ہوں..... ٹھیک ہے تم ایڈمیشن سے ایک ہفتہ پہلے بتا دینا میں انتظام کر دوں گی..... وہ سنجیدگی سے کہہ کر دوبارہ اپنے کام میں منہمک ہو گئی.....

ٹھیک ہے..... کیریئر ہی تو بنا رہا ہے..... عیاشی تو نہیں کر رہا..... مجھے اس کی ہیلپ ضرور کرنا چاہیے..... وہ شانی کے اندر چلے جانے کے بعد خلوص سے سوچ رہی تھی کہ ذرا دیر میں بن جائے گا مجھے کیا فرق پڑتا ہے اس کی تو زندگی بن جائے گی۔

اسی معروف ترین شب و روز کے درمیان ایک بہت اچھا رشتہ آ گیا..... لڑکا ایم۔ بی۔ اے تھا اور ہوٹل مینجمنٹ میں ڈپلومہ ہولڈر تھا اور کسی پرائیویٹ فرم میں اچھی پوسٹ پر تھا خالدہ بیگم کی کسی سہیلی کے توسط سے یہ رشتہ آیا تھا فیملی بھی بہت مختصر تھی۔ دوسرے لڑکا خوش شکل اور خوش لباس بھی تھا..... خالدہ بیگم کو تو یہ رشتہ دل و جان سے پسند آیا انھوں نے بہت خوش خوش نغمانہ سے تذکرہ کیا.....

مگر نغمانہ نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر صاف انکار کر دیا.....

سوال ہی نہیں پیدا ہوتا امی..... تقریباً پانچ سال تک تو آپ میری شادی کا سوچیے بھی نہیں..... ممکن ہی نہیں.....

کیوں.....؟ خیریت تو ہے؟ ایک دو نہیں پورے پانچ سال؟ وہ پکا بکا رہ گئیں..... امی..... ابھی شانی کا بی بی۔ اے شروع ہو رہا ہے پھر آپ کو پتہ ہے مجھے اپنے نام کا گھر حاصل کرنے کا کتنا شوق ہے۔ اس کے لیے میں دن رات محنت کر رہی ہوں..... پلیز امی مجھ پر زبردستی کچھ مسلط نہیں کیجیے گا ورنہ میں ٹوٹ جاؤں گی..... پلیز..... خالدہ بیگم نے اس کا ملتجی انداز دیکھا اور کچھ سوچنے لگیں.....

بیٹیاں اپنے گھر ہی میں اچھی لگتی ہیں..... شادیاں تو ایک دن ہونا ہی ہوتی ہیں پھر اتنی تاخیر کرنے کا کیا فائدہ.....؟

مگر اس پر کوئی دلیل کارگر نہ ہوئی.....

شانی کی تم ذمہ دار نہیں ہو جو میں اس کی وجہ سے تمہاری عمر نکالوں..... اسے اپنی حیثیت کے مطابق پلاننگ کرنا چاہیے..... رہی گھرور کی بات تو یہ محض تمہارا پاگل پن ہے۔ جس عورت کو محنت کی عادت ہوتی ہے وہ جہاں رہتی ہے اس کے پاؤں جم جاتے ہیں خالدہ بیگم یہ کہہ کر اس کے پاس سے ہٹ گئیں.....

عارف حسین بھی کئی روز متفکر رہے اور دونوں دادیوں نے تو آسمان سر پر اٹھا لیا پانچ سال؟ اُوئی..... دلہن ایسی ڈھلتی عمر میں بیاہ ہوگا تو کتنی عمر میں جوان بچے دیکھے گی.....؟ صابرہ دادی نے کہا۔

اور نہیں تو کیا..... یہی تو صحیح عمر ہوتی ہے شادی کی بال بچے پالنے کی طاقت بھی ہوتی ہے عورت میں اور اپنی زندگی میں اپنی اولاد کی بہاریں بھی دیکھ لیتی ہے..... ڈھلتی عمر میں عورت کمزور ہو جاتی ہے..... اس میں کہاں وہ ہمت طاقت ہوتی ہے جو چڑھتی عمر میں ہوتی ہے..... انو بوا بولیں.....

اے عارف حسین کیوں نہیں سمجھاتے بٹی کو..... مدتوں بعد دونوں کسی بات پر متفق ہو کر عارف حسین کے پیچھے پڑ گئیں.....

اماں وہ عام لڑکی نہیں ہے..... جسے صرف شادی بچوں کا شوق ہو..... اس میں کام کرنے کی لگن اور وقت کی قدر و قیمت کا احساس ہے..... میں اسے ہمیشہ کے لیے اداس نہیں کر سکتا..... انھوں نے ماں اور پھوپھی سے صاف معذرت کر لی بہرحال خواتین نے بہت سمجھداری سے کام لے کر یہ رشتہ فرحانہ کی طرف منتقل کر دیا۔ انھیں اتنے اچھے رشتے سے ہاتھ دھونا منظور نہیں تھا.....

گھر میں ہر وقت کی چیں چیں بند ہوئی اور نغمانہ نے بھی سکوں کا سانس لیا.....

.....✿.....

شانی کے دو سمسٹر تک تو وہ اپنے خواب کی تکمیل کا پہلا مرحلہ شروع نہ کر سکی۔ البتہ قدرت نے اس پر مہربانی کی اس کی ترقی ہوگئی۔ دو ہزار روپے کا اضافہ ہوا..... تو اس نے ایک اپارٹمنٹ باپ کے صلاح مشورے سے بک کرا لیا لوکیشن بہت اچھی تھی فرسٹ فلور، کارنر اور ویسٹ اوپن اس کی خصوصیات تھیں شہر کے بالکل درمیان میں تھا۔ پانچ کمرے تین واش روم وسیع بالکونی، کار پارکنگ وغیرہ کی سہولت تھی۔

تکمیل تک وہ اسے بارہ لاکھ میں پڑنا تھا اس نے بہرحال اچھی اُمید کے ساتھ بسم اللہ کر دی اور تیس ہزار جمع کرا کر بکنگ کرا لی..... اگلے مہینے تک اسے مزید بیس ہزار جمع کرا کر ایلوکیشن لیٹر حاصل کرنا تھا.....

وہ بہت خوش تھی..... اس کے سب سے حسین خواب کی تکمیل کا پہلا مرحلہ شروع ہوا تھا۔ اس کی چال میں عجیب سی ترنگ آ گئی تھی..... شانی کے لیے اس نے تون لے لیا تھا..... اس کی کلاسز بھی شروع ہو چکی تھیں اس وقت واقعی حقیقی مسرت سے دوچار تھی..... بالکل شل گھر میں داخل ہوتی تھی مگر صبح کو پھر ایک نئی امنگ کے ساتھ بیدار ہوتی تھی.....

آج وہ ذرا جلدی آ گئی تھی اس لیے نہانے چلی گئی نہا کر واپس آئی تو مغرب کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں سب گھر والے نماز کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اس نے بھی جلدی جلدی ڈرائیر سے بال سکھائے اور نماز پڑھنے چھت پر چلی گئی موسم آج کل بہت اچھا تھا نہ گرمی نہ سردی کھلی چھت پر نماز پڑھنا بہت اچھا لگتا تھا.....

نماز پڑھنے کے بعد وہ یونہی جائے نماز پر بیٹھ کر کسی دھیان میں گم ہوگئی اسے احساس تک نہ ہوا کہ رات کی سیاہی پھیلنا شروع ہوگئی ہے.....

خالدہ بیگم نے آ کر اسے چونکایا.....

خیریت تو ہے بہت دیر نہیں ہوگئی..... کیا قضاء بھی پڑھ رہی تھیں..... انھوں نے سرمئی اُجالے میں اس کا چہرہ بغور دیکھا۔

ہاں..... نہیں تو امی..... بس ایسے ہی ٹھنڈی ہوا اچھی لگ رہی تھی..... وہ چونک کر مسکرائی بیٹا ایسی بھی گرمی نہیں پڑ رہی کہ نہا کر چھت پر بیٹھ گئیں..... کوئی پریشانی تو نہیں ہے خدانخواستہ.....؟ وہ فکرمندی سے پوچھ رہی تھیں.....

نہیں امی..... اللہ کا شکر ہے کوئی پریشانی نہیں..... آفس میں بھی ماحول بہت اچھا ہے..... سب لوگ فرینڈلی کام کرتے ہیں..... آپ فکرمند نہ ہوں..... ایسی کوئی بات نہیں..... اس نے ماں کو مطمئن کیا.....

وہ میں کئی روز سے تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ جی امی کہیے..... ایسی بھی کیا بات ہے جو آپ اتنا تکلف کر رہی ہیں.....؟ اسے ماں کی جھجک پر حیرت ہوئی.....

نہیں تکلف کی بات تو نہیں..... بیٹی ہو تم میری..... سوچتی ہوں تم پریشانی میں نہ پڑ جاؤ..... مگر وقار بہت پیچھے پڑا ہوا ہے تو مجبوراً تم سے بات کر رہی ہوں.....

وقار کی بات ہے؟ کہیے..... کیا مسئلہ ہے اس کا.....؟ اس نے قدرے الجھ کر پوچھا..... وہ باہر جانا چاہتا ہے..... کہتا ہے آپی کب تک اپنی محنت سے سب کو ایزی رکھیں گی ان کی شادی بھی کرنا ہے اور مجھے یہاں کوئی ہینڈسم سی جاب ملنا مشکل ہے..... ایک ریکروٹنگ کمپنی میں بات کی ہے..... کوریا جانے کے لیے..... ایک لاکھ بیس ہزار تک کا خرچہ ہے کہہ رہا ہے آپی اگر ارینج کر دیں تو میں تھوڑا تھوڑا کر کے دو سال میں واپس کر دوں گا..... اب تم اپنی سہولت سامنے رکھتے ہوئے جواب دو یہ خیال نہ کرو کہ منع کر دینے پر بھائی ناراض ہو جائے گا..... وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بہت شفیق لہجے میں کہہ رہی تھیں.....

ایک لاکھ بیس ہزار؟!!! وہ دھک سے رہ گئی.....

وہ گھر جیسے داخلی دروازے پر وہ ہاتھ دھرے کھڑی تھی پھر جادو کے زور سے دُور پرے نظر آنے لگا.....

لون لینے کے بعد جو سیلری ہاتھ آیا کرے گی کیا وہ ماہانہ قسط آسانی سے دے دیا کرے گی؟ پھر اس کے اپنے اخراجات بھی ہوتے ہیں.....

اگر وہ منع کر دے گی تو بھائی کے دل میں کدورت نہ آ جائے کہ میں نے وسائل رکھتے ہوئے اس کی ہیلپ نہیں کی..... شاید وہ زندگی بھر یہ بات نہ بھلا سکے..... یوں بھی اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کا کھلا ہاتھ دیکھ کر اس کے بہن بھائی اس سے بہت سی توقعات وابستہ کر چکے ہیں.....

میں کوشش کروں گی امی..... آپ کو پرسوں تک فائنل جواب دے دوں گی..... اس نے اٹھتے ہوئے کہا.....

ٹھیک ہے بیٹا..... میں اس کے کان میں یہ بات ڈال چکی ہوں کہ تمہاری بہن مردوں کی طرح صبح سے شام تک محنت کرتی ہے روپیہ پیڑوں میں نہیں اُگتا تم اس کی رقم ضرور واپس کر دینا خالدہ بیگم نے یہ یقین دہانی ضروری سمجھی..... کہ وقار اس سے مدد نہیں قرض مانگ رہا ہے..... وہ جواب میں کچھ نہیں بولی..... اور جائے نماز تہہ کرنے لگی تھی.....

اس نے ڈیڑھ لاکھ کا لون مزید لے لیا اور تنخواہ تقریباً آدھی رہ گئی.....

ایک لاکھ بیس ہزار اس نے وقار کو دے دیے بیس ہزار جمع کرا کر اپارٹمنٹ کا ایلوکیشن لیٹر حاصل کر لیا اور دس ہزار جمع رہنے دیے کہ شانی کے اگلے سمسٹر میں کام آئیں گے..... پیسہ ملتے ہی وقار نے بھاگ دوڑ تیز کر دی..... اسے دیارِ غیر میں کمانے کا جنون لاحق ہو چکا تھا آخر اس کی بھاگ دوڑ رنگ لائی اور ایک رات وہ کوریا روانہ ہو گیا۔ دونوں دادیاں بہت روئیں اور دونوں نے اپنے اپنے امام ضامن باندھے اور الوداع کہا.....

گھر میں سب نے سکون کا سانس لیا کہ آخر اس گھر کا لڑکا بھی برسرِ روزگار ہو گیا اور عارف حسین کا بوجھ بٹ گیا.....

انہی دنوں فرحانہ کے سسرال والے شادی پر زور دینے لگے کہ بات چیت ہوئے آٹھ مہینے ہو گئے ہم نے چھ مہینے کا کہا تھا.....

عارف حسین نے اسّی ہزار دفتر سے قرض لے کر خالدہ حسین کے ہاتھ پر رکھ دیے کہ میں اتنی رقم ہی کا انتظام کر سکتا ہوں.....

خالدہ بیگم نے اللہ کا شکر ادا کر کے اسی میں انتظام شروع کر دیا..... لڑکی کی شادی کے چند بڑے اخراجات ہوتے ہیں..... ضروری فرنیچر چند سونے کی چیزیں اور بارات کے دن کا کھانا..... خالدہ بیگم فرحانہ کے سسرال والوں سے شروع ہی میں صاف صاف بات کر چکی تھیں کہ ہم سفید پوش لوگ ہیں آپ ہم سے بھاری جہیز کی توقع مت کیجئے گا..... وہ لوگ بھی بہت سیدھے سادھے وضع دار لوگ تھے کہنے لگے کہ ہم نے لڑکی اور خاندان دیکھ کر رشتہ کیا ہے ورنہ ہابر جیسے لڑکے کو بہت پیسے والوں کے ہاں بھی رشتہ مل سکتا تھا.....

مگر دنیا داری کی خاطر بھی اور اپنی عزت کے لیے بھی بہت کچھ نہیں تو تھوڑا بہت کرنا پڑتا ہے۔ برتن و کپڑے تو خالدہ بیگم نے اچھے خاصے جمع کیے ہوئے تھے۔ بس زیور، فرنیچر اور کھانا اس وقت انھیں لازمی کرنا تھا کم سے کم پانچ سو مہمانوں کے کھانے کا انتظام تو لازمی کرنا تھا..... اور روایتی شادی بیاہ کے کھانے پر تقریباً ڈیکوریشن سمیت تیس ہزار لاگت آ رہی تھی..... زیور بھی پندرہ بیس ہزار سے کم میں نہیں بننا تھا..... بہت مدت پہلے جب عارف حسین نے یہ گھر خریدا تھا خالدہ بیگم نے اپنا تمام جہیز بری کا زیور فروخت کر دیا تھا..... ہاتھ میں ایک انگوٹھی اور گلے میں ایک چین پڑی ہوئی تھی..... درمیانے درجے کا بیڈ

روم سیٹ بھی چالیس ہزار تک کا تھا..... پھر دیگر چھوٹی چھوٹی رسومات اور آنے والے مہمانوں کے اخراجات..... پھر کپڑوں کی سلائیاں کڑھائیاں..... سوچتے سوچتے ان کے سر میں درد ہونے لگتا.....

آج کل یہ ان کا معمول بن گیا تھا کہ ضروری کاموں سے فارغ ہو کر کونے میں پڑے پلنگ پر لیٹ کر اُدھیڑ بُن میں لگ جاتیں ذہن ماحول سے کٹ جاتا..... دونوں ساسوں کی بحث و تکرار بھی ان کو متوجہ نہ کر پاتی.....

نغمانہ سے ان کا یہ حال چھپا نہ رہ سکا اس نے تو ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک ماں کو بے کار پلنگ پر لیٹے نہیں دیکھا تھا..... آخر وہ پوچھ بیٹھی.....

امی جان..... کیا بات ہے آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں.....؟

الحمدللہ..... بیٹا میں بالکل ٹھیک ہوں بس یونہی تھکن اتارنے کو لیٹ گئی تھی۔ تم پریشان نہ ہو..... انھوں نے بیٹی کو تسلی دی.....

نہیں امی کوئی بات تو ہے جو آپ چھپا رہی ہیں..... بہت ہی چپ چپ رہنے لگی ہیں۔ مجھ سے بھی چھپاتی ہیں؟ اس نے شکوہ کیا.....

نہیں بیٹا غلط گمان نہ کرو وہ فرحانہ کی تاریخ طے ہو گئی ہے ناں بس انتظامات کے بارے میں سوچتے بیٹھ جاتی ہوں..... اچھا خاصہ کام ہوتا ہے شادی بیاہ بھی..... وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئیں.....

کیا کوئی فائننشلی پرابلم..... ابو نے پیسے تو دیے ہیں ناں.....؟ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا.....

ہاں دیے تو ہیں..... مگر تھوڑا بہت قرض اُدھار کرنا پڑے گا جس سے میں ہمیشہ بچتی آ رہی ہوں..... وہ آہستگی سے کہہ رہی تھیں..... تمھارے ابو نے اسّی ہزار دیے ہیں کپڑے برتن لحاف کمبل وغیرہ تو گھر میں موجود ہیں مگر فرحانہ نے جو بیڈ روم سیٹ پسند کیا ہے وہ پچاس ہزار سے کم کا نہیں ہے کہہ رہی تھی تھوڑے بہت تو آپی بھی دے سکتی ہیں ان کی سیلری اچھی خاصی ہے تب ہی تو ہزاروں روپے کے ہر مہینے کپڑے بنا لیتی ہیں خیر میں نے اس کو سمجھا دیا کہ اسے باہر نکلنا ہوتا ہے ظاہر ہے جگ بھاتا پہننا ہوتا ہے..... کچھ تم نے بھی دے دے کر اس کا دماغ خراب کر دیا ہے..... خالدہ بیگم دل کی بات زیادہ دیر چھپا نہ

پائیں..... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں امی..... اچھے کپڑے میری کمزوری تھے مگر اب مجبوری ہے جس سیٹ پر میں کام کر رہی ہوں..... جس ماحول میں کام کر رہی ہوں اچھے کپڑے اب میری ملازمت کا حصہ ہیں.....

آپ نے اس کے فرنیچر کے لیے جو رقم فکس کی تھی اس میں جتنے کم پڑ رہے ہیں میں دے دوں گی..... فرحانہ ابھی بہت چھوٹی ہے مگر خواب تو سب ہی دیکھتے ہیں ناں امی؟ اور شادی تو ایک بار ہوتی ہے..... اتنا کہہ کر وہ فوراً اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی..... ''اپنا گھر'' چار قدم مزید فاصلے پر چلا گیا تھا.....

.....✿.....

فرحانہ کی شادی بخیر و خوبی انجام پا گئی..... وقار البتہ شادی میں شریک نہ ہو سکا تھا ابھی تک اس نے گھر میں کوئی پیسہ ٹکا نہیں بھیجا تھا کہ ابھی تنخواہ سے کچھ بچ نہیں پاتا بہت مہنگائی ہے دوسرے کنوینس کا بڑا مسئلہ تھا اس لیے تھوڑے بہت پیسے بچا کر میں نے کار لے لی ہے..... انشاء اللہ عنقریب کچھ پیسے بھیجوں گا.....

خالدہ بیگم نے یہ بات دونوں ساسوں کو بتا دی تھی جو آئے روز ان سے پوچھا کرتی تھیں..... اتنے دن ہو گئے وقار نے گھر کچھ بھیجا نہیں..... کہیں لونڈے نے کسی میم سے بیاہ تو نہیں کر لیا؟ ایک دن انو بوا کو تشویش لاحق ہوئی۔

تمھارے منہ میں خاک..... انو بوا کبھی تو نیک کلمہ منہ سے نکال لیا کرو۔ صابرہ دادی تو تڑپ کر رہ گئیں..... ان کی کل پانچ نواسیاں تھیں انھوں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ دو تو وہ عارف حسین کے گھر میں لائیں گی تاکہ ان کی بیٹیوں کا بوجھ ہلکا ہو اور بچیاں اپنوں ہی میں آئیں ان کے خوابوں کے شیشے پر تو انو بوا نے پتھر کھینچ مارا تھا.....

ارے تو بھابی میں کون سا انہونی کہہ رہی ہوں..... یہی کرتے ہیں لونڈے پرائے دیس کمانے جاتے ہیں اور وہیں گھر گھرستی کر لیتے ہیں..... خوب کہا لونڈے نے کہ بچتا ہی نہیں لاکھ دو لاکھ لگا کر وہ وہاں پیٹ پالنے گیا تھا..... ماں کی ٹھنڈی چھاؤں چھوڑ کر..... روٹی تو اسے پیٹ بھر باپ کی کمائی سے بھی مل رہی تھی..... انو بوا کے دل میں جو تھی کہہ ڈالی..... اب بیٹھی تاؤ پیچ کھاتی رہیں صابرہ بیگم.....

ردیس میں انسان کی سو مجبوریاں ہو سکتی ہیں..... جمعہ جمعہ آٹھ دن تو ہوئے ہیں

اسے یہاں سے گئے..... کبھی کچھ اچھا نہ سوچنا..... مُردہ بولے کفن پھاڑ کے بولے.....
صابرہ دادی کی تو غصے سے بری حالت ہو رہی تھی..... کتنا ارمان تھا انھیں پوتے کے بیاہ کا اذر بارات میں چکن کا کرتا اور آڑا پائجامہ پہن کر دولہا کے برابر میں بیٹھنے کا.....

اتفاق سے عارف حسین گھر ہی میں تھے اور کمرے میں فائلیں کھولے بیٹھے تھے..... گھمسان کا رَن پڑتے دیکھا تو سفید جھنڈی لہراتے باہر آ گئے..... اور دونوں سے جنگ بندی کی درخواست کی کہ وہ دفتر کا ضروری کام کر رہے ہیں اور انھیں خاموشی درکار ہے..... ماں نے اور پھوپھی نے بہرحال ان کی بات رکھی اور اِدھر اُدھر ہو گئیں..... خالدہ بیگم نے کلمۂ شکر ادا کیا.....

.....✿.....

وقت اپنی چال چلتا رہا..... وہ دھیرے دھیرے اپنے ٹارگٹ سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ اس دوران بہت سے رشتے آئے مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔

جب تک تمام لون ادا نہیں ہو جاتا اور اپارٹمنٹ کی آخری پے منٹ نہیں ہو جاتی وہ شادی نہیں کر سکتی..... انو بوا کانوں سے خاصی پٹ ہو چکی تھیں اس لیے اب چلتی ہوا تک سے الجھتی تھیں..... صابرہ بیگم تو خود بھی الجھنے سے کترانے لگی تھیں کہ کہو کھیت کی سنے کھلیان کی..... دوئم انھیں الجھ کر تسلی بھی نہیں ہوتی تھی اس لیے کہ وہ جو تیر چلاتی تھیں خطا ہو جاتا تھا..... مثلاً

صابرہ بیگم نے کہا یہ بیسن کی ٹونٹی آدھی کھلی ہوئی تھی آدھی ٹنکی خالی ہو گئی ہو گی تو انو بوا نے صحن سے چلانا شروع کر دیا.....

ہاں بھئی ہم کب کہتے ہیں کہ ہم پیچھے سے نواب ہیں..... ذات کے فقیر سمجھ لو..... مگر تم بھی کیا کرو بھابی اب فقیروں میں تو آ ہی گئی ہو.....

صابرہ دادی کانوں کو ہاتھ لگاتی کچن میں خالدہ بیگم کے پاس پناہ لیتیں..... توبہ توبہ دلہن تم وقار کو ٹیلی فون کر کے کہہ دو کہ انو بوا کے لیے کان کا آلہ بھیج دے..... ورنہ کسی دن میرے دماغ کی شریانیں پھٹ جائیں گی.....

چھوڑیں اماں..... بے چاری اونچا سنتی ہیں..... معاف کر دیا کریں..... خالدہ بیگم درخواست گزاری..... انہی دنوں دو حادثے پیش آئے ایک افسوس ناک اور ایک خوشگوار.....

تین سال بعد وقار نے پچاس ہزار کا چیک ساتھ اپنی شادی کی اطلاع مع دلہن کی تصویر کے بھیجی..... اس نے ایک نہایت حسین کورین لڑکی سے شادی کر لی تھی..... سارے گھر میں جیسے صف ماتم بچھ گئی دونوں دادیوں نے تخت پر بیٹھ کر اجتماعی گریہ زاری کی.....

ہائے..... میرے مولا..... کس گناہ کی سزا ملی ہے.....؟ صابرہ دادی نے آہ و بکا کی اے..... اللہ..... یہ دن دکھانے کو اتنی لمبی عمر دی تھی.....

خالدہ بیگم اور عارف حسین کمال ضبط کا مظاہرہ کیا اور دونوں کو سمجھانے بجھانے لگے.....

چھوڑیں اماں..... یہ مقدر کی بات ہوتی ہے..... شادی تو بچوں کی پسند ہی سے ہونا چاہیے..... زندگی انھوں نے گزارنا ہوتی ہے..... ہم تو اپنی زندگی جی چکے۔ اب تو یہ بچوں کا وقت ہے..... ٹھیک ہے اس نے اپنی خوشی پوری کی..... آپ اس کی خوشیوں کے لیے دعا کیجیے..... شکر ہے اللہ کا کہ بچے کسی غلط راستے پر نہیں پڑے اپنا کما رہے ہیں اپنا کھا رہے ہیں.....

اے ہٹاؤ عارف حسین یہ خود کو دھوکہ دینے والی باتیں ہیں..... اسی کو تو ناہنجار اولاد کہتے ہیں پچاس ہزار بھیج رہا ہے باپ کو تین سال میں وہ بھی شاید واپسی کا راستہ کھلا رکھنے کے خیال سے..... بہن سے لاکھ سوا لاکھ لے کر گیا تھا اس کا تو واپس کر دیتا..... آخر اس کو بھی اپنے گھر کی کرنا ہے کہ نہیں.....؟ صبح سے شام تک کولہو کے بیل کی طرح لگی رہتی ہے۔ اس سے تو لاکھ درجہ اچھی ہماری بچی رہی..... باپ کا بوجھ بھی بانٹا اور گھر میں بھی چک دمک کی..... گھر میں ہر طرح کی سہولت کی..... اللہ نصیب اچھا کرے..... صابرہ دادی نے عارف حسین سے اتفاق نہیں کیا..... وہ جس عمر میں تھیں وہاں مصلحتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی.....

عارف حسین پھر جواب میں کچھ نہیں بولے.....

اسی کے ساتھ ساتھ خوشگوار حادثہ نغمانہ کی زندگی میں ہوا..... اس کے آفس میں ایک نئے صاحب وارد ہوئے تھے پینتیس، چالیس کے درمیان عمر تھی..... پہلے کسی پرائیویٹ فرم میں تھے..... یہاں اچھا موقع ملا تو ریزائن کر کے اِدھر چلے آئے بہت گریس فل پرسنالٹی تھی..... وہ یہاں سینئر تھی وہ عہدے میں اس سے سینئر تھے.....

جبکہ وہ نغمانہ سے بہت متاثر تھے روزانہ کی بات چیت کے دوران یہ بھی کھلا.....

وہ بہت صاف گو، دوٹوک اور اختصار میں بات کرتے تھے.....

دو ماہ بعد ہی انھوں نے نغمانہ کو پرپوز کر دیا تھا..... اپنے والدین کے توسط سے جبکہ نغمانہ سے ان کا کوئی رومانس وغیرہ بھی شروع نہیں ہوا تھا..... جب اسے ماں کے ذریعے علم ہوا کہ اسد کمال کے والدین اس کے رشتے کے سلسلے میں آئے تھے تو وہ حیران رہ گئی..... ایک لڑکی ہونے کے ناطے وہ ان کی نظروں کے معنی خیز پیغامات تو سمجھ رہی تھی مگر اسے یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ اتنے سیریس ہو چکے ہیں..... اسے یہ سب بہت اچھا لگا..... اس لیے کہ ثابت ہو رہا تھا کہ اسد کمال بہت پریکٹیکل بندے ہیں..... نہ انھوں نے اس سے ڈائیلاگ بولے نہ ہوٹنگ و ڈرائیو کی طرف آئے..... بس سیدھے سیدھے ''کام کی'' بات کی.....

اس نے ماں کو بتا دیا کہ یہ سب اسد کمال نے اپنے طور پر کیا ہے میری ان سے کوئی کٹ منٹ نہیں ہے..... آپ لوگوں کی مرضی ہے قبول کریں یا ریجیکٹ..... مجھے البتہ اعتراض اس لیے نہیں ہے کہ وہ میرے کام اور کام میں تجربہ کو بہت اہمیت دیتے ہیں وہ مجھے جاب چھوڑنے کے لیے شاید کبھی نہ کہیں.....

کئی دن صلاح مشورے ہوتے رہے.....

عارف حسین کو بس یہ کمی کھٹک رہی تھی کہ اسد کمال کی ذاتی رہائش گاہ نہیں تھی۔ چار بہنوں کی شادیاں کرنے کے بعد ایک بہن اور بھائی کی ذمہ داری اب بھی ان پر تھی اس لیے کہ ان کے والد انجائنا کے مریض تھے اور ریٹائرڈ لائف گزار رہے تھے.....

صابرہ دادی نے کہا..... ارے یہ تو دیکھو کتنا ذمہ دار بچہ ہے..... چار بہنوں کی شادیاں کر چکا ہے..... اور اب بھی اس پر ذمہ داریاں ہیں کیسے پیسہ ٹکا جوڑتا اور گھر بناتا اس بے چارے کی تو اپنی عمر ہو گئی..... کتنی بڑی قربانی ہے یہ..... اور وہ جو ہماری لونڈیا پانچ کمروں کا گھر کر رہی ہے..... ان پانچ کمروں میں کیا بھوت ناچیں گے؟ رہنے بسنے کے لیے ہی تو بنایا ہے.....

عارف حسین نے ماں کے خیالات سے اتفاق کیا۔ جو ساتھ میں یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ ہماری بچی کی عمر ڈھل رہی ہے..... اس عمر میں اچھا کنوارا رشتہ مل رہا ہے بہت جانو بہرحال یہ رشتہ منظور کر لیا گیا اس بات کو اہمیت دیتے ہوئے کہ نغمانہ کو کوئی اعتراض

نہیں..... شانی کا بی۔ بی۔ اے بھی تکمیل کے مراحل میں تھا اس لیے نغمانہ نے مکمل آمادگی کے ساتھ یہ رشتہ منظور کیا.....

اور اس طرح سے اسے زندگی کے بخشے ہوئے یہ دو ماہ جو شادی سے پہلے ملے بہت حسین اور خوشگوار لگے..... اس لیے کہ اب سات گھنٹے ہونے والے شریک سفر کے ساتھ گزرتے تھے..... رات کو بہت خوبصورت احساسات کے ساتھ وہ نیند کی وادیوں میں اترتی تھی.....

اسد کمال نے آنے والی زندگی کے حوالے سے اس سے کبھی کوئی بات نہ کی مگر ان کی مسکراہٹ اسے بہت کچھ سمجھاتی وہ مسکراہٹ جس میں ''دفتر'' درج ہوتے تھے..... ان دو ماہ میں اس کی عمر بھر کی تھکن اتر گئی.....

اور پھر یہ دو ماہ ہوا کے خوشگوار جھونکے کی طرح گزر گئے..... اور ایک شام وہ بھرپور انداز میں روایتی دلہن بنی..... بہت خوبصورت سرسبز لان میں شادی کی تقریب منعقد ہوئی اور وہ نغمانہ عارف حسین سے نغمانہ اسد کمال بن گئی.....

اسد کمال نے شب زفاف بھی اپنے نہایت عملی ہونے کا ثبوت یہ کہہ کر دیا.....

بیڑہ غرق ہو ان وکٹورین افسانہ نگاروں کا کہانی وہاں ختم کرتے ہیں جہاں سے حقیقت میں کہانی شروع ہوتی ہے..... مطلب یہ کہ رومانس کا انجام شادی یا ہمیشہ کا میل جبکہ دو انسانوں کی کہانی تو اصل میں شادی کے بعد شروع ہوتی ہے..... نغمانہ نے سنجیدگی میں کمال مزاح کو سراہا اور عروسانہ ادا کے ساتھ مسکرا پڑی۔

.....✿.....

زندگی کا دھارا اگرچہ تبدیل ہوا تھا مگر مقصد اور لگن کا عالم وہی رہا بلکہ اب تو اپنے گھر کی اہمیت کا احساس اور شدت سے ہونے لگا تھا جب گھر کا کرایہ، بجلی، گیس، فون کی مد میں چھ سات ہزار کھٹ سے ہاتھ سے نکل جاتے.....

اسد کمال ذمہ داریوں کی دلدل میں دھنسے ہوئے تھے انھوں نے نئی دلہن کا ایسا کوئی نخرہ نہیں اُٹھایا جس پر ''خرچہ'' ہوتا ہو..... زندگی کی ساتھی ہونے کے ناطے نغمانہ نے ان کی مجبوری کو حقیقت پسندی کے ساتھ قبول کیا..... اور پہلے کی طرح اپنا بوجھ خود ڈھونے لگی کہ..... اسد کمال کو روز ہی نیا مسئلہ درپیش ہوتا تھا.....

بھائی کی فیس جمع کرانا ہے.....

بہن کی سہیلی کی شادی ہے گفٹ دلانا ہے.....

بابو جی کو آج چیک اپ کے لیے جانا ہے.....

فلاں بہن کے بچے کی سالگرہ ہے.....

فلاں کے بچے کا عقیقہ ہے.....

اسد کمال نے یہ کمال ہوشیاری کی خرچہ نغمانہ کے ہاتھ میں دے دیا شاید ماں سے صلاح مشورے کے بعد.....اب یہ ہوتا ہر قسم کے "ڈیوز" کے لیے اس سے "رابطہ" کیا جاتا.....

نغمانہ کے تو ہوش اُڑ گئے.....اپارٹمنٹ کے ڈاکومینٹیشن چارجز وہ جمع کرا چکی تھی مگر پوسیشن سے پہلے کے لئے تلئے ابھی بھگتانا تھے.....شادی سے پہلے تو ہاتھ میں کچھ نہ کچھ رک جاتا تھا اب تو پہلی کا شدت سے انتظار رہنے لگا اس نے دبی دبی زبان میں کہہ دیا کہ اس کی بچت نہیں ہو پا رہی اسے اپارٹمنٹ کے کچھ ڈیوز، ادا کرنا ہیں.....اگر جلد ادا ہو جائیں تو اچھا ہے تاکہ ہم سب اپنی ذاتی رہائش گاہ میں منتقل ہو جائیں.....

جس کے جواب میں اسد کمال نے کہا.....

نغمانہ میری اپنی کچھ ترجیحات ہیں..... ظاہر ہے سامنے بھائی کا کیریئر ہے۔ چھوٹی بہن کی ذمہ داری ہے..... میں تو ابھی بھی شادی کرنا نہیں چاہتا تھا مگر بہنیں امی بہت مصر ہوئیں کہ اور عمر نکل گئی تو ڈھنگ کی لڑکی نہیں ملے گی..... وہ اتفاق سے جاب چینج کی اور تم سے ملاقات ہو گئی۔ تمہاری دو خوبیوں نے مجھے تمہاری طرف متوجہ کیا ایک تو یہ کہ تم بہت کوآپریٹو نظر آئیں دوسرے یہ کہ تمہاری ہینڈسم سی جاب..... مجھے یہ اطمینان تھا کہ مجھے تمہاری طرف سے مین ٹین نیس کا ٹینشن نہیں ہوگا.....گھر کا کیا ہے ایک دن بن ہی جائے گا۔ فی الحال تو لائف پارٹنر کی حیثیت سے تمہیں میرے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرنا چاہیے.....

وہ اتنی صاف گوئی سے بولے کہ وہ ششدر سی ان کی صورت دیکھتی رہ گئی.....

مائی گاڈ.....نئے لوگ نئی توقعات؟!!! اور وہ اس کا حسین سپنا.....؟

اس کا اپنا گھر..... اور وہ اس گھر میں صبح سے شام تک مصروف..... اس کے ہاتھوں سے سجا سنورا گھر..... وہ گھر سنبھالنے والی اور ایک کمانے والے کی کمائی سے مکان کو گھر بنانے والی.....ایک روایتی عورت جو ہر تھکن اس لیے خوشی خوشی اوڑھتی ہے کہ وہ اپنے

گھر کے اعتماد کے ساتھ جب رات کو میٹھی نیند سوئے گی تو نئی نویلی صبح کو تھکن اپنی ایک ایک شکن کے ساتھ اتر چکی ہوگی.....

پھر ایک بھائی کا کیریئر.....

پھر ایک بہن کی ذمہ داری.....

اپنا گھر.....جو تعمیر تو ہو چکا مگر تعبیر ہو کے نہیں دے رہا.....

وہ چپ چاپ وارڈ روب کھول کر صبح آفس جانے کے لیے لباس منتخب کرنے لگی.....

عید کا جوڑا

"دیکھو دلہن...... نکھے بھوکے نہیں ہیں ہم لوگ...... اور نہ تمہارے ہاں کے عید کے جوڑے بنا میری بچی عید نہ منا سکی...... اللہ کا دیا سب کچھ ہے...... لیکن...... خاندان کنبے میں ناک چوٹی کی فکر بھی کرنا پڑتی ہے۔" انھوں نے جھک کر پیک تھوکی اور گھٹنوں پر ہاتھ باندھ کر مزید تیز تیز منہ چلانے لگیں۔

"خالہ جان! میں نے آپ کو بتایا ناں......"

"بس دلہن...... آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں...... ہماری طرف سے بات ختم سمجھو...... سرسلامت پگڑی بہت۔" انھوں نے منہ پھیر کر جواب دیا۔

"خالہ جان......!" افشاں بھابی نے حیرت سے ان کو دیکھا...... "ایک عید کے جوڑے کی وجہ سے......"

"ہم نے دیکھا نہیں تھا کبھی عید کا جوڑا۔ اس لیے راہ دیکھتے رہے تمہاری...... تمام چاندرات۔" انھوں نے جل کر کہا۔ اور پھر جھک کر پیک تھوکی۔

"فقط عید کے جوڑے کی خاطر؟"

"تمھارے لیے ہوگا وہ عید کا جوڑا۔ ہمارے لیے تو ناک چوٹی کا سوال بن گیا تھا۔"

"میں نہیں سمجھتی خالہ جان......" افشاں بھابی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

"دیکھو دلہن...... اب بحث کی تو گنجائش ہی نہیں۔"

ہماری طرف سے آج بات بالکل ختم، سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے ویسے بھی اسد کے لچھن پسند نہیں تھے۔ وہ تو دوسروں کے دباؤ میں آ کر میں نے ہامی بھر لی تھی...... زمانے بھر کی لڑکیاں تو اسے گھیرے میں لیے رہتی ہیں۔ گھر سے باہر زیادہ رہتا ہے۔"

"بس کریں خالہ جان۔ اب آپ کو "لچھن" بھی نظر آ رہے ہیں۔ اسد جیسا کوئی

داماد شاید ہی آپ کو ملتا۔ اتنی انا بھی اچھی نہیں ہوتی...... ایک طرح سے بزرگ سمجھ کر میں نے آپ کے پاؤں تک چھو لیے...... آپ کو میری بات کا اعتبار ہی نہیں آیا...... ایسی بے اعتباری کی فضا میں تو رشتے واقعی بے کار ہیں۔"

افشاں بھابی بھی برا مان کر کھڑی ہو گئیں اور نصیرہ بیگم منہ موڑے برابر پان چباتی رہیں۔

انھوں نے اجرک اٹھا کر لپیٹی۔

"اچھا خدا حافظ......!" وہ باہر نکلنے لگیں تو برآمدے میں نیلوفر کھڑی نظر آئی...... اس کا چہرہ پھیکا پڑ چکا تھا۔ وہ ستون سے ٹکی جانے کہاں گم تھی۔

"جا رہی ہیں......؟" اس نے اٹک اٹک کر بمشکل پوچھا تھا۔

"ہاں بھئی...... تمہاری امی جان کی یہی مرضی ہے...... میں نے تو بہت کوشش کی انھیں سمجھانے کی۔" انھوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑے دکھ سے کہا۔

"مجھے تو ساتھ یہ بھی فکر ہے کہ اسد کو بری خبر کیسے سناؤں گی۔ اور چاند میاں تو شاید رو ہی پڑیں۔ یہ سن کر کہ اب تمہارا اور اس کا دیور بھابی کا رشتہ نہیں رہا...... کاش خالہ جان ٹھنڈے دل سے سوچ سکتیں۔"

انھوں نے آزردگی سے کہا اور اس کی پیشانی چوم کر اپنے بیٹے کو آواز دینے لگیں۔

ان کے جاتے ہی وہ اپنے کمرے میں گھس گئی اور نصیرہ بیگم شاید اسے سنانے کو اونچا بول رہی تھیں۔

"ارے سمجھتے کیا ہیں یہ لوگ خود کو...... اس قدر گئی گزری ہے میری بچی۔ اسد سے لاکھ اچھے رشتے جھولی پسارے کھڑے ہیں...... لو...... ان کے نزدیک عید کا جوڑا کوئی بات ہی نہیں۔ چاندرات کو لوگ آتے رہے اور پوچھتے رہے کہ کیا کیا آیا ہے نیلو کی سسرال سے......؟ ارے کس قدر ہیٹی ہوئی نندوں کے سامنے...... یہ نور افشاں سدا ننھی ہی بنی رہیں گی۔ خیر سے برسوں پرانی بیاہتا "جروا" ہیں۔ ابھی تک انھیں ریتیں رسمیں ہی نباہنی نہیں آئیں۔ اللہ بخشے ان کی ساس کو...... پانچ برس منگنی رہی...... کیا تھال بھر بھر عید بقرید (بقرعید) پر جاتے تھے۔ انھی نور افشاں کے گھر...... دیور کی دفعہ میں ننھی بھولی بن گئیں کماؤ دیور ہے۔ اور یہ گنوں پوری...... بیر چھواتی ہیں اور کمائی بھی اڑاتی ہیں۔ یہ گر بھی کسی کسی کو آتے ہیں۔"

"تو، اللہ...... اب یہ امی جان چپ بھی ہوں گی یا نہیں۔" لا متناہی بہتان طرازی

پر نیلو کڑھ کڑھ کر بے حال ہو گئی تھی۔

''کہہ رہی ہیں صرف عید کا جوڑا۔ ارے پتھر پڑی عقل ہے..... اتنا نہیں پتا کہ منگنی کے بعد عید بخرید (بقرعید) پر سہیلیاں رشتے دار خصوصیت سے لڑکی کی عیدی دیکھنے آتے ہیں۔ جو آیا اُسی نے پوچھا۔ عیدی کیسی آئی ہے..... ابھی تک تو آئی نہیں آتی ہی ہوگی کہہ کہہ کر چاند رات بھی گزر گئی۔

وہ سہیل کی امی بھی بولی تھیں..... ''دستور نہیں ہوگا ان کے ہاں.....''

ارے سارے زمانے میں دستور ہے عیدی کا۔ یہ کیا غاروں میں رہتی ہیں۔ ارے میری کوئی ایسی کرکری کرے میں تو شکل نہ دیکھوں عمر بھر.....''

بہانہ بھی کیا تو کیا..... کہ چاند میاں کا انتظار کرتے رہے..... کہ وہ رسالپور سے آ جائیں تو عیدی لے کر جائیں۔ عید والے روز بھی چاند میاں نہیں پہنچے تو ہم سب بہت پریشان ہو گئے تھے..... ہونہہ..... کھانے چاٹنے کے ڈھکوسلے ہیں..... دیوروں پر یہ جتاتی رہیں کہ میں تم سے اتنی محبت کرتی ہوں کہ تمہارے بغیر کوئی کام نہیں کرتی۔ ماں سے زیادہ چاہے پھاپھا کٹنی کہلانے..... دیور تو ہیں نا سمجھ..... کیا جانیں تریا چلتر۔''

''خدا کی پناہ۔'' نیلو نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ ''کیا بتا دیا ہے امی جان نے افشاں بھابی کو۔ آگ ہی لگ جائے ان رسموں کو۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

سارے خاندان کا کہنا تھا..... تھانیدار تو تھے عمر حیات خان مگر اثرات ان کی بیوی میں آ گئے تھے۔ گھر کے بچوں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے گھر میں تھانے داری دیکھی ایک مختصر سی رفاقت کے بعد عمر حیات خان ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ لیکن اس بیوگی میں بھی تھانیداری کا وہی عالم رہا۔

تین بیٹیاں تھیں۔ ارجمند، تاجور اور نیلوفر۔ دو بیٹیاں تو انھوں نے چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق بیاہ دی تھیں۔

بس اب نیلوفر رہ گئی تھی..... جس کے رشتے بچپن ہی سے آ رہے تھے۔ لیکن ایک رشتہ انھیں اس بنا پر بہت پسند آیا کہ صرف تین بھائی تھے۔ نہ ساس نہ سسر، نہ نند۔ یہ رشتہ ڈائرکٹ ''بیری پر پتھر'' تھا یعنی اس رشتے میں کوئی درمیان میں نہیں تھا۔

نصیرہ بیگم کی دُور کی رشتے دار بہن تھیں جو تین بچوں کو وراثت میں چھوڑ کر دو

برس پہلے گزر چکی تھیں۔ ساس کے مرنے کے بعد تمام ذمے داری ان کی اوّلین بہو نور افشاں پر آ پڑی تھی۔

تاجور کی سسرال اور نور افشاں کی سسرال کے درمیان..... صرف دو میٹر کا فاصلہ بمشکل ہوگا۔ تاجور کی شادی کو سات برس ہونے کو آ گئے تھے اور نیلو کبھی رات بہن کے ہاں نہیں ٹھہری تھی۔ اور نہ کبھی ارجمند اپیا کے ہاں۔ اگر کبھی اس کا جی بھی چاہتا کہ کسی بہن کے ہاں ایک رات ٹھہر جائے تو امی جان اسے نظروں سے روک لیتیں۔ واپسی پر جواز بھی پیش کر دیتیں۔

''بھرے پُرے سسرال میں رہتی ہیں تمہاری بہنیں۔ الگ گھر ہوتا تو دوسری بات تھی تاجور۔ ارجمند کے گھر والے ہیں لیکن تمہارا ان سے کوئی رشتہ نہیں۔ زمانے بھر کے جوان کنوارے رشتے دار بچے کدکڑے مارتے پھرتے ہیں..... ان کے ہاں۔''

بات ہی ایسی ہوتی کہ وہ کچھ نہ کہہ پاتی۔ ہمیشہ کی طرح خاموش ہو رہتی۔

اس روز تاجور آپی کے بڑے بیٹے کی سالگرہ تھی..... انھوں نے اسے صبح ہی سے ہُلوا بھیجا تھا۔

وہ زرد پھول دار سوٹ میں ملبوس پسینے میں شرابور کام میں لگی ہوئی تھی۔ نصیرہ بیگم کی خوش دلی کی اجازت کیا ملی وہ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر اور ایک سوٹ نکال کر بیگ میں رکھ کر بہنوئی کے ساتھ اسی حلیے میں گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اتنی عجلت خوف کا نتیجہ تھی۔ ماں کا موڈ بدل جانے کا خوف۔ کبھی کبھار ہی اسے خوش دلی سے باہر جانے کی اجازت ملتی تھی۔

تاجور کے ہاں بہت سارا کام بکھرا پڑا تھا۔ حالانکہ اس کی ساس نندیں بھی کام کاج میں مصروف تھیں۔ وہ بھی ان کا ہاتھ بٹانے لگی۔ جب شام کو سارا گھر تیار ہو رہا تھا وہ کباب تل رہی تھی۔ کباب تل کر باہر آئی تو تاجور نے منت سے کہا۔

''نیلی..... جان..... ذرا میری بیٹی کی زلفیں سنوار دو..... میں ذرا مہمانوں کو دیکھ لوں..... اور ہاں فٹافٹ تیار کر کے اور خود بھی تیار ہو کر آ جاؤ..... شاباش.....''

وہ تو عجلت میں نکل گئیں۔ وہ بھانجی کو سامنے بٹھا کر اس کی مَتی مَتی پونی ٹیلو بنانے لگی۔

''اللہ..... لولو..... تمہارے بال کتنے پیارے ہیں.....'' اس نے چار سالہ بھانجی

کے ریشم ایسے بال نرمی سے ہاتھوں میں تھامے۔

نونو بنا جواب دیے اس کے گھٹنوں کے درمیان پھنسی کھڑی رہی۔

اس نے اس کے بال سنوار کر اس کی آنکھوں میں کاجل لگانا چاہا..... نونو نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے..... ''نیلی خالہ..... میں نہیں.....'' اس نے ادھورے الفاظ میں انکار کیا۔

''جنگلی ہو..... اتنی پیاری لگتی ہیں آنکھیں.....'' اس نے ہتھیار ڈال کر اسے گھٹنوں کی قید سے آزاد کر دیا۔ محبت بھری سوچوں کے بیچ مسکراتی نیلوفر کا چہرہ دمک رہا تھا۔

وہ جلدی سے تیار ہونے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی مگر بری طرح سٹپٹا گئی۔

سامنے سفید کرتے پائجامے میں ملبوس کنجی آنکھوں والا شخص بڑی دلچسپی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

زرد قمیض اور ہرنگ ہی چست پائجامے میں اس کا قامت بجلی کی طرح کوندا تھا۔

عمر کی بہاروں نے اپنے تمام تر دلکش رنگ اسے دے ڈالے تھے۔

اس نے مڑ کر دوپٹہ اٹھایا اور گھبرائے ہوئے انداز میں راہداری میں غائب ہوگئی تھی۔ الجھے ہوئے بالوں والی چوٹی ابھی بھی وہیں جیسے ہلکورے لے رہی تھی۔

وہ جلدی جلدی تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آئی تو تاجور نے مسکرا کر نئے لوگوں سے اس کا تعارف کرایا۔

فیروزی کرتے شلوار۔ سادہ سی چپل اور چاندی کی جھمکیاں پہنے وہ محفل میں واحد مؤنث تھی جس کا چہرہ میک اپ کی آلائش سے پاک تھا۔

شرمائی شرمائی۔ دبی دبائی سی۔ کتنے لوگوں نے ستائش بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ نور افشاں تو گویا اسے نظروں ہی میں لے بیٹھی تھیں۔ حیلے بہانے سے کوئی نہ کوئی بات کرنے لگتیں۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی اسے مل چکی تھیں۔

جب ریفریشمنٹ کی فارمیلٹی پوری ہوئی اور مہمان۔ خوش گپیوں میں مصروف ہوگئے تو وہ تاجور کی دونوں نندوں اور ملازمہ کے ساتھ چیزیں اٹھوانے لگی۔ برتن وغیرہ بھی سمیٹے جا رہے تھے۔ اس نے کوارٹر پلیٹوں کا ایک ڈھیر اٹھالیا۔ اور ان ہی پلیٹوں پر چمچوں سے برا ہوا ایک پلاسٹک کا ڈونگہ بھی رکھ لیا۔ پینٹری کی طرف مڑتے مڑتے پلیٹیں غیر

متوازن ہوگئیں۔ وہ گھبرا کر انہیں سنبھالنے کی کوشش میں حواس باختہ سی نظر آنے لگی تھی۔

اسی وقت کوئی نیکی کا فرشتہ آگے بڑھا اور تقریباً آدھی پلیٹیں ڈونگے سمیت اُچک لیں۔

اس نے فرشتے کی شکل دیکھی تو بری طرح گڑبڑا گئی۔

''آپ اپنی ٹانگوں سے زیادہ کام لیں گی تو ٹانگوں پر ٹیکس زیادہ لگے گا غالباً۔''

''جی۔ جی۔؟؟'' وہ اس کی بات نہ سمجھ سکی۔ مارے پریشانی کے جی۔ جی کر کے رہ گئی۔

''بھئی ایک مرتبہ میں اتنے سارے برتن اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کام دو چکروں میں بھی تو ہوسکتا تھا۔''

وہ اس کے ساتھ ساتھ اس کی رہنمائی میں چلتے ہوئے بولا۔

اس نے برتن رکھ کر اپنی دانست میں اس سے چھپ کر اپنے دوپٹے سے پیشانی پر چمکتے پسینے کے قطرے صاف کیے تھے۔

.....✿.....

اس کے بعد اکثر تاجور نصیرہ بیگم سے خفیہ باتیں کرتی پائی گئیں۔ نور افشاں نے بھی جلد جلد حاضری دینا شروع کی۔ اور ان تمام معموں کا حل ایک روز نکل آیا۔ جب نور افشاں نے ایک سادہ سی تقریب میں اس کی انگلی میں خوبصورت سی انگوٹھی پہنا کر اپنے دیور کی امانت بنا دیا۔

اس نے بھی ایک خوبصورت سا تصور اسد سے وابستہ کرلیا۔ اسے ان کی وہ پرشوق اور شریر سی نظریں بار بار یاد آئیں۔ جب بھابی اسے انگوٹھی پہنا رہی تھیں تو سرگوشی میں بولیں۔

''اسد نے کہا تھا میری طرف سے ایک جملہ تحفے میں دے دیجئے گا۔'' وہ آیا۔ اس نے دیکھا۔ اس نے فتح کرلیا۔''

بارحیا سے اس کی پلکیں رخساروں پر لرز کر رہ گئی تھیں۔

ماں نے اسے ہمیشہ حقیقت کے کانٹوں پر چلنا سکھایا تھا۔ وہ اس کی نظروں کو بے حد اچھا لگا تھا مگر اس نے سپنوں سے حتی الامکان پرہیز کیا تھا۔ اب جو بن مانگے بہت کچھ

جھولی میں آ گرا تو اس پر ٹوٹ کر نکھار آیا تھا۔ نصیرہ بیگم نے تو شاید کبھی محسوس ہی نہیں کیا تھا کہ اس میں کیا نئی تبدیلیاں آئی ہیں۔ پہلے ہی اس کا حسن دو چند تھا ان کی نظر میں۔ ایک مامتا کی نظر کا حسن۔ دوسرا اکا قدرتی ملکوتی سا حسن۔

لیکن اسے یہ خوشی راس نہ آئی۔ آج وہ جب سونے لیٹی تو نصیرہ بیگم اوپر کرائے داروں کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔ جب وہ جاگی تو ان کی فیصلہ کن آوازیں اس کا دل دہلا گئیں نور افشاں کا منت کرنے کا انداز۔ پشیمانی کا انداز۔ عید کا دوسرا دن تو تھا۔ وہ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر چائے بنانے کے لیے کچن کی طرف آئی ہی تھی کہ افشاں رخصت ہوتی نظر آئیں۔ وہ ماں کی انا کے پل صراط پر سفر کرتی افشاں کی طرف بڑھی تھی۔ اس کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ معمولی رسمیں بھی بعض اوقات سولی پر چڑھا دیتی ہیں؟

اس نے ماں سے اپنے جذبات چھپائے اور روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہوگئی۔

تاجور، میاں کے ساتھ ہانپتی کانپتی رات ہی کو آ لیں ماں کے مخصوص رکھ رکھاؤ کی وجہ سے وہ جذباتی تو نہ ہوئیں البتہ رسانیت سے ماں سے معاملہ دریافت کیا۔

''جنہوں نے تمہیں خبر پہنچائی۔ وجہ نہیں بتائی؟'' انہوں نے کڑے تیوروں سے بیٹی کو دیکھا۔

''امی جان۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں۔ یہ تو میرے علم میں بھی ہے کہ ان کے ہاں چاند میاں کی وجہ سے بے حد پریشانی رہی۔ چاند میاں نے فون پر کہا تھا کہ وہ۔ چاند رات کو ہر حال میں گھر پہنچیں گے۔ چاند میاں کو لے کر آنا تھا۔ جوڑا۔ عیدی وغیرہ۔ ان کے ہاں سب تیاری تھی۔ چاند میاں کے دوست انہیں اپنے ہاں لے گئے۔ وہاں ان کو سخت بخار آ گیا۔ اب گاؤں میں فون بھی نہیں تھا کہ اطلاع ہو جاتی۔''

''عیدی رات کی رات میں نہیں آتی۔ تم نے تو ان کا پھونکا کھا رکھا ہے۔ مگر مجھ پر اثر نہیں ہوتا ان باتوں کا۔ سنا۔ چاند میاں دیور ہیں۔ دلہن کے۔ ساس نہیں ہیں۔ تمہاری بڑی پھوپھی کوئی موقع جانے دیتی ہیں جی جلانے کا؟ کیسی بات مار کر گئی تھیں۔ کہ شادی سے پہلے ہی لڑکی کا اتنا خیال ہے۔ بیاہ کر لے جائیں گی تو پاؤں کے نیچے ہاتھ دھرا کریں گی۔

تمہاری بھلی پھوپھی کتنا سر ہوئی تھیں رشتے کے لیے۔ خوب جتا کر گئیں۔ کہ بھابی جان۔ بھلے گھر لڑکی کا رشتہ کیا ہے۔ عید تہوار پر خبر تک نہیں لیتے۔''

''امی جان۔ پھوپھیوں نے ہماری آپ کا دل جلایا۔ سزا ان بے چاروں کو کیوں؟''

''ارے تو انہوں نے ہی تو موقع دیا کہ میری نندیں مجھے یہ سب سنا کر گئیں۔ اور بھئی ان کا بھی کہنا ٹھیک۔ عید تہوار پر بے نیازی کا یہ عالم۔ ان موقعوں پر تو ننگے بوچے بھی خوشی کر لیتے ہیں۔''

''امی جان۔ بتایا ہے ناں کہ وہ چاند میاں۔''

''چاند میاں۔ چاند میاں۔ ساس سے بڑھ کر ہو گئے چاند میاں۔ بس کرو تاج۔''

تاج کے میاں نے بھی ساس کو ذرا سمجھانا چاہا۔

''دیکھو بھئی۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ والا معاملہ ہے اس موضوع پر کوئی مجھ سے کلام نہ کرے۔

نیلو۔ چائے لاؤ بھئی۔ اتنی دیر سے بہن بہنوئی آئے بیٹھے ہیں۔''

انہوں نے گویا گفتگو ختم کرنے کا اعلان کیا۔

دیوار سے لگی کسی اچھے نتیجے کی منتظر نیلوفر جلدی سے کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

ساتھ والوں کے ہاں پھر تاجور کا فون آیا تھا کہ نیلوفر کو بھیج دیں۔

مگر نصیرہ بیگم نے سختی سے منع کر دیا تھا۔

''جب تک افشاں کے دیور کی کہیں ہو نہیں جاتی تم وہاں نہیں جاؤ گی۔''

''یہ لو۔ یہ اچھی مصیبت۔'' وہ کڑھ کر رہ گئی۔ اب بہن کے ہاں جانے پر بھی پابندی۔ منہ میں گر رہی ہوں جا کر ''ان'' کے؟'' وہ چڑ سی گئی۔ بولی تو نہیں۔ سوچ کر رہ گئی۔

''وہ گاؤں سے منشی جو حساب کتاب لکھ کر لایا تھا اسے دیکھ لو۔'' نصیرہ بیگم نے اس کا دھیان اس طرف سے ہٹانا چاہا۔

''دیکھ لوں گی۔ میرا جی نہیں چاہ رہا ابھی۔'' وہ بددلی سے کہہ کر رسالہ لے کر

لیٹ گئی۔

نصیرہ بیگم نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر جانے کیا سوچ کر برآمدے میں بچھے تخت کی طرف بڑھ گئیں۔

شام گئے ساتھ والوں کا چھوٹا بیٹا پھر آدھمکا۔

''نیلی آپا۔ تاج آپی کا فون آیا ہے۔ آ کر سن لیں۔''

نصیرہ بیگم نے پیشانی پر سینکڑوں بل ڈال کر بچے کی طرف دیکھا۔

''تاج سے کہہ دو۔ پہنچ جائیں گے شادی والے دن۔''

وہ جو فون سننے کا ارادہ کر کے اٹھ ہی رہی تھی دھم سے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

تاج کی منجھلی نند شاہانہ کی شادی تھی۔ نیلوفر کی اس سے گاڑھی چھنتی تھی۔ تاجور کی شادی ہونے تک وہ گہری سہیلیاں بن چکی تھیں۔ سات آٹھ برس پرانی دوستی تھی۔ اس وقت تو دونوں بچیاں ہی تھیں۔ اس کا تو تاج کی طرف کم ہی جانا ہوتا تھا۔ مگر وہ تاج کے ساتھ اکثر آتی تھی۔

اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا وہ اُڑ کر وہاں پہنچ جائے۔ مگر ماں کی سخت گیری کے سبب جل کڑھ کر بیٹھ رہی تھی۔

''بھئی، جب منگنی توڑ دی تو کیا تعلق رہ گیا۔ نہ لینا ایک نہ دینا دو۔

تاج کے ہاں ان سب کا بہت کھلا آنا جانا ہے۔ میرے دل کو یہ بات نہیں بھائی کہ تم وہاں ان لڑکوں کے سامنے پڑو۔'' یہ عجیب منطق تھی ان کی۔

وہ ماں سے جل کر بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر جوش پر ماں کا خوف غالب آ گیا تھا۔

وہ سوچ سوچ کر دل مسوس رہی تھی..... وہاں کتنا مزا آ رہا ہوگا۔ کتنا ہلا گلا کر رہے ہوں گے سب۔ ارجمند اپیا بھی پہنچ چکی ہوں گی۔ آج تو مائیوں ہے نا۔ میری تو قسمت ہی خراب ہے۔ وہ خاموشی سے آنسو بہانے لگی۔

نصیرہ بیگم نے اس کی خاموشی کو گہرائی سے محسوس کیا تھا۔ سلام پھیر کر اُسے آواز دی۔

''ارے..... نیلو..... عشاء کی نماز پڑھ لی.....؟''

''پڑھ رہی ہوں امی جان.....!'' وہ خود پر قابو پا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اگلے روز سہ پہر کو تین بجے تاجور نے پھر فون کے ذریعے اُسے بلوا بھیجا۔ وہ فون سننے اور ماں کا شکوہ بہن سے کرنے کو بیتاب ہو رہی تھی۔ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے بیٹا..... جاؤ تاج آپی سے کہہ دو آ جائیں گے۔ ہفتہ پڑا ہے شادی میں۔''

''میں فون تو سن آؤں آپی کا۔'' وہ برہمی چھپاتی ہوئی بولی۔

''کیا ضرورت ہے جب کہلا بھیجا ہے..... اور یہ تاج.....'' اس لڑکی کے انداز نہیں بدلیں گے۔ پرسوں سے فون ہی کھڑکائے جا رہی ہے..... اسے گھر میں کام ہی نہیں کوئی۔ ایک مرتبہ کی بات سمجھ میں نہیں آتی اس لڑکی کے..... حالانکہ سمجھ رہی ہوگی کہ میں نیلو کو کیوں نہیں بھیج رہی۔''

''تو امی جان..... یہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ یہ پابندی کیا معنی.....؟ اگر ان کی شادی ساری عمر نہ ہوئی تو میں ساری عمر بہن کے ہاں نہیں جاؤں گی؟''

آخر وہ کہہ ہی گئی۔

نصیرہ بیگم کے تلوؤں میں لگی سر پر بجھی..... وہ تیز تیز تنفس کے دوران اُسے گھورتی رہیں۔ انھیں اس کے لہجے سے ''بغاوت'' کی بو آئی۔

''ہاں، ساری عمر نہیں جاؤ گی..... اور ساری عمر شادی کیوں نہ ہوگی اس کی؟ کیا سنیاس لے لے گا تمہاری خاطر؟''

اشتعال میں ان کے منہ سے نہایت نازیبا بات نکل گئی۔

''کیا پتا۔'' وہ بھی جل کر بڑبڑائی۔ حد سے زیادہ پابندیاں بھی برداشت کے بند توڑ دیتی ہیں۔

''عید کا جوڑا نہ ہوا مصیبت ہو گیا۔ اتنی سی معمولی بات کے پیچھے۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں گھس گئی..... بول تو گئی تھی..... حالانکہ دل اندر ہی اندر لرز کر رہ گیا تھا۔ اس نے شاہانہ (تاجور کی نند) کی شادی کے کیا کیا پروگرام بنا رکھے تھے۔

نصیرہ بیگم نے ''گونگی'' کی زبان کیا دیکھی انھیں تو گویا سانپ سونگھ گیا۔ کبھی گھٹنوں پر ہاتھ باندھ لیتیں..... کبھی..... جھک کر پیک تھوکتیں..... کبھی گاؤ تکیہ اِدھر سے اٹھا کر اُدھر رکھ دیتیں۔ عجب اضطراری کیفیت تھی۔ معاً انھوں نے پاؤں سلیپر میں پھنسائے۔ سر پر سفید چادر اُوڑھی..... اور باہر نکل گئیں۔

نیلو نے ماں کو جاتے دیکھا۔ کچھ سمجھ نہ سکی۔ پائپ لگا کر بڑے آرام سے برآمدے کا فرش دھونے لگی۔ دل کو ذرا ڈھارس سی ہوئی کہ امی جان کچھ بولیں نہیں۔ ورنہ وہ تو اندر ہی اندر ڈر رہی تھی۔ کہ اب بم پھٹا۔ اب پھٹا۔

جوڑا باندھ کر کپڑے سمیٹ کر وہ فرش دھونے میں مگن ہوگئی۔

تھوڑی ہی دیر میں نصیرہ بیگم واپس آگئیں اور آتے ہی آواز دی۔

''اکرم۔'' (کرائے داروں کا بڑا لڑکا)

''جی خالہ جان!'' وہ اُوپر سے جھانکا۔

''نیچے آؤ۔''

وہ تیزی سے بھاگتا ہوا چلا آیا۔

''جاؤ۔ شبیر (دودھ والا) سے کہو۔ خاں صاحب کی بیگم کہہ رہی ہیں دس سیر دودھ کا انتظام کردے۔''

''دس سیر دودھ۔'' جھاڑو ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ وہ ہونق سی ہوگئی......

''دودھ سے غسل ہوگا کیا......؟'' اس نے جھاڑو واپس اٹھا کر ٹھونکی۔

فرش دھو کر اس نے کپڑے دھونے کے لیے...... مشین لگانا چاہی۔ اسی وقت اکرم اندر داخل ہوا۔

''اکرم!''

''جی خالہ جان......؟''

''اس سے کہو...... کوئی ضرورت نہیں کپڑے دھونے کی۔''

''اوہ خدا...... امی جان تو سخت خفا معلوم ہوتی ہیں۔ ''اِن ڈائریکٹ'' بات کر رہی ہیں۔'' اس نے مشین واپس اسٹور میں دھکیل دی۔

پھر وہ اپنی قمیص سینے بیٹھ گئی کہ شادی میں شاید چلے ہی جائیں...... تقریباً ایک گھنٹے بعد باہر شور وغل سُنائی دیا۔

وہ کچھ سمجھ نہ پائی تھی کہ تاجور اور افشاں بھابی کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔

افشاں نے اس کے سر پر سرخ آنچل ڈال دیا۔

''کپڑے سِل رہے ہیں بنو؟''

''اکرم! بڑی بیٹھک کا دروازہ کھول دو۔'' امی جان کی پُرجلال آواز اس کے کانوں نے سنی۔

اب وہ حواس باختہ سی نظر آنے لگی تھی۔ قینچی اس کے گھٹنے کے نیچے چبھ رہی تھی۔ مگر وہ اس چبھن تک سے بے نیاز تھی۔

افشاں نے اسے گلے لگا کر اس کا رخسار چوما۔

پریشانی کی کوئی بات نہیں میری جان۔ بعد میں سب غصہ وصہ اتر جاتا ہے۔ تم دیکھنا...... فی الحال تو ہم سے یہ اچانک ملنے والی خوشی نہیں سنبھل رہی ہے۔''

''ہائیں......! اس کے خاک پلے نہیں پڑا۔

''ارے مزے کی بات بھی سنو...... اسد تو حیدر آباد گئے ہوئے ہیں ان سے کہہ دیا ہے کہ وہ فوراً سیدھے سسرال پہنچ جائیں ورنہ لیٹ ہو جانے کی صورت میں وہ خود ذمہ دار ہوں گے۔ ویسے اتنی زیادہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ خالہ جان نے الٹی میٹم دے دیا ہے۔ آج کی تاریخ میں تمھیں اپنے گھر لے جائیں۔ اسد نہ بھی پہنچے تو بغیر نکاح کے لے جائیں گے۔ نکاح وہیں ہو جائے گا۔'' وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑیں۔

''ویسے تم تو بڑی نمبردار نکلیں بھئی۔''

انھوں نے شرارت سے اس کے گلے میں بازو ڈال کر اپنے ساتھ لگا کر بڑے انداز سے اسے گھورا۔

تاجور...... کے چہرے سے فکرمندی متشرح تھی۔ وہ بہانے سے افشاں کو باہر لے گئی۔ خود نظریں بچا کر کمرے میں چلی آئی۔ پیچھے سے دروازہ بند کرلیا۔

''اے نیلی کی بچی...... کیا ڈرامہ ہے یہ؟'' انھوں نے اس کا کندھا ہلایا۔

وہ جو اَب کچھ کچھ سمجھ رہی تھی کندھے سے ٹک کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اور من وعن ساری کتھا کہہ سنائی۔

''خدا کی قسم آپی...... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ امی جان یہ قدم بھی اٹھا سکتی ہیں۔ اس میں زیادہ قصور آپ کا بھی ہے۔ کیوں کر رہی تھیں بار بار فون...... جب ہی تو مجھے غصہ آگیا تھا۔''

تاجور کو اس پر ٹوٹ کر پیار آگیا۔

''اچھا اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ پتا ہے امی جان نے پہلے افشاں بھابی کو فون کیا کہ شام پانچ بجے آ جائیں اور نیلوفر کو رخصت کرا کے لے جائیں...... آج اور صرف آج۔ آج نہیں تو پھر کبھی نہیں۔ ساری عمر اسی چوکھٹ پہ بٹھائے رکھوں گی اور کہیں رشتہ نہ کروں گی۔ نہ تمھارے ہاں نہ اور کہیں۔ اس لیے کہ اس کے منہ سے تمھارے گھر کا کلمہ نہیں چھٹتا...... مجھے تو افشاں بھابی نے بتایا۔ وہ تو مارے خوشی کے دیوانی ہو رہی ہیں۔ جب امی نے انکار کر دیا تھا بہت روئی تھیں میرے پاس آ کر...... وہ تو شکر کرو بھلے لوگوں میں امی جان نے اپنی اَنا کی انتہا دکھائی ہے۔ کوئی دوسرے قسم کے لوگ ہوتے تو گزر مشکل ہو جاتی۔ تم فکر نہ کرو۔ ماں ہیں۔ اس وقت سلگ رہی ہیں کہ تم نے ان کی مرضی کے خلاف سوچ کا اظہار کیا۔ بعد میں جب اُبال اتر جائے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بہت چاہتی ہیں تمھیں...... حالانکہ غلط طریقے سے مل رہا ہے۔ مگر ایسا گھرانہ مشکل ہی سے نصیب ہوتا ہے۔ بہت ہی اچھے لوگ ہیں۔ دن رات کا آنا جانا ہے ہمارا......''

انھوں نے ڈر اور خوف سے ہنکتی نیلوفر کو ساتھ لگا کر محبت سے تسلی دی۔

''آپ کو نہیں معلوم...... امی جان اپنی انا کے پیچھے جان بھی دے سکتی ہیں۔ وہ مجھ سے کبھی بات نہیں کریں گی۔'' وہ بُری طرح رو رہی تھی۔

''بے کار کی باتیں مت کرو نیلی...... اتنا مجمع اکٹھا ہو رہا ہے تماشا بنواؤ گی۔ امی جان کے مزاج کا کس کو نہیں پتا۔ بولو؟''

''ارے تاج...... بھئی باہر نکلو۔ اندر ہی کی ہو کر بیٹھ گئیں۔''

باہر سے ارجمن اپیا کی آواز آئی۔ تاج نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ ساتھ ہی بہن کو اشارہ کر دیا کہ نیلو سے کوئی سوال جواب نہ کریں۔ ارجمند ہونق سی ہو گئیں۔ دلہن سوئی، دھاگہ، قینچی لیے مشین کے سامنے بیٹھی دھواں دھار رو رہی تھی۔ اور حلیے سے صاف ظاہر تھا کہ نہائی دھوئی بھی نہیں۔ تاجور زبردستی اسے باتھ روم تک لے کر گئیں۔ وہیں دروازے میں کھڑے کھڑے اس کی چوٹی کھولی اور جلدی...... غسل...... سے فارغ ہونے کی تنبیہہ کی اور چور نظروں سے ماں کو دیکھتی اس سامان کے پاس آ گئیں جو ایمرجنسی میں افشاں بھابی لائی تھیں۔ ساڑھی وہ ابھی آتے ہوئے خرید لائی تھیں۔ ساتھ ساتھ میک اپ کا سامان بھی اور اپنا سیٹ اٹھا لائی تھیں اور ایک سینڈل کا جوڑا جو اس کی عیدی میں شامل تھا۔

وہ عیدی جو نصیرہ بیگم نے لینے سے انکار کر دیا تھا۔

ڈیڑھ گھنٹے کا الٹی میٹم تھا جس میں یہی کچھ انتظام ہو سکتا تھا جب وہ پنکھے کے نیچے بیٹھی بال سکھا رہی تھی۔ غلغلہ اٹھا۔ دولہا میاں سفید شلوار قمیص میں قدم رنجہ فرما چکے ہیں۔ مغرب سے صرف چند منٹ پہلے نکاح ہوا۔ وہ اسی طرح تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ ارجمند نے ماں کی خوشامد کی کہ اس وقت تو اس کے پاس چلی جائیں۔ انھوں نے بیٹی کو گھورا۔

''جن سے ناتا ٹوٹنے کا اسے قلق تھا۔ وہ اسے بیاہ لے جا رہے ہیں۔ کیوں رو رہی ہے اب؟''

''امی جان۔'' ارجمند نے پھر ان کی خوشامد کی۔

''دیکھو ارجمند! میری قوتِ برداشت کو مت آزماؤ۔''

ارجمند نے محسوس کر لیا کہ...... قطعی گنجائش نہیں...... وہ چپ چاپ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''اور ہاں سنو......!'' انھوں نے بیٹی کو پکارا۔

ارجمند تعجب سے انھیں دیکھنے لگیں کہ اب کیا ہو گیا۔

اس کی شادی کی نیت سے جو کچھ جمع کیا تھا۔ وہ پیچھے پیچھے پہنچ جائے گا۔ یہ اس کے حصے کی زمین کے کاغذات ہیں۔ تم دونوں کو تمہارا حصہ دے چکی ہوں۔ رہ گیا یہ مکان تو جب مرنے لگوں گی تو تینوں کے حصے کر جاؤں گی۔

یہ کاغذات نور افشاں کو دے دو لے جا کر...... کہہ دو کہ ہم خاندانی عزت دار لوگ ہیں۔ بیٹی عزت سے بیاہیں یا غصے میں...... خالی ہاتھ نہیں بیاہتے۔''

وہ اپنے خاندانی ہونے کا تذکرہ کرنا پھر نہیں بھولیں۔ اور ارجمند کو وہیں گم صم چھوڑ کر باہر نکل گئیں۔

نیلوفر نے میک اپ کرنے سے سختی سے انکار کر دیا۔ تاجور نے بھی اس کی حالت کے پیش نظر مزید اصرار نہ کیا۔ نور افشاں کا بلاؤز اس کے گدرائے جسم پر بالکل فٹ آ گیا تھا...... اور نورتن کا سیٹ پہن کر وہ ایسی رُوپ متی بنی کہ تاجور اور ارجمند نے اس کے ڈھیروں پیار لے ڈالے۔

اچھے سے ہوٹل سے بہترین بریانی، قورمہ شیر مال آ گئے کھیر گھر پر تیار ہوئی۔ رخصتی کے وقت ذرا کی ذرا نصیرہ بیگم آئیں۔ سب باہر چلے گئے۔

''کوئی اپنے بچوں کا بُرا نہیں چاہتا۔ لیکن دنیا میں خونی رشتوں کے علاوہ عزت و وقار بھی اپنی جگہ اہم ہیں..... تم کیا سمجھتی ہو ہم نے بلاوجہ منگنی توڑ کر تماشا بننا چاہا تھا.....؟ نہیں ضرورت ہمیں ایسی اولاد کی جو ہماری ذات پر شک کرے ہماری محبت کو نہ پہچانے..... جن لوگوں سے رشتہ ٹوٹنے پر تم رنجیدہ تھیں اور جن کی خاطر تم نے زندگی میں پہلی مرتبہ میرے سامنے زبان کھولی اب تم انہی لوگوں میں رہو..... ہمیشہ کے لیے آج سے تم میرے لیے اور میں تمہارے لیے مر گئی۔''

نیلوفر تو ان کا یہ اجنبی انداز دیکھ کر وہیں ڈھے گئی۔ ہر بات اس کے تصور سے کہیں زیادہ تھی۔ آہ..... وہ بات جو میں نے معمولی جان کر کہہ دی تھی..... کیا اتنی بڑی تھی؟ اسے یہ سوچ کر ہی چکر آ گئے تھے۔

وہ اسد کے بیڈ روم میں بیٹھی ہوئی تھی..... ذہنی طور پر بالکل غائب تھی..... باہر سے شور کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''ارے اسد..... بھئی وہ اپنا ڈنر سوٹ پہن لو.....''

''ارے..... رے ٹھہرو..... تم اس حلیے میں کمرے میں مت جاؤ وہ دوبارہ بے ہوش ہو جائے گی..... میں تمہارا سوٹ لاتی ہوں۔ چاند میاں..... تم وہ اپنی سرخ ٹائی نکال لاؤ..... اور وہ وہائٹ شرٹ تمہارے بھائی جان کی..... میں نے پریس کر کے لٹکائی تھی۔ وہ بھی لے آؤ..... اور تم جا کر میرے کمرے کے باتھ روم میں..... حیدر آباد کی گرد اتارو.....''

''دیکھیں بھابی..... میں ''چندے کے سامان'' سے دولہا نہیں بنوں گا.....'' اسد کی شوخ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی..... ساتھ ہی بے تحاشہ فلک شگاف قہقہے.....

''ارے جا بھی چکو اب.....'' اسی دم بھابی کمرے میں داخل ہوئیں۔ غالباً وہ وارڈ روب سے اسد کے کپڑے نکال رہی تھیں۔ وہ سوتی بن گئی تھی۔

وہ سوٹ ہاتھ میں تھامے تھامے اس کے قریب آ گئیں۔

''سونا منع ہے..... کسی کی محنت رائیگاں چلی جائے گی۔ کم از کم خواب نما حقیقت کو محسوس کر لینے دو..... کہہ رہے ہیں موصوف یقین نہیں آ رہا بھابی..... ذرا اچھا سا یقین دلا دینا.....''

وہ جھکیں اور اس کے رخسار کو چوم لیا..... اس نے کوئی تاثر اپنے چہرے پر نہیں

آنے دیا۔ اسی طرح لیٹی پلکیں جھپکاتی رہی..... اس کی نظروں کے سامنے صرف ایک چہرہ گردش کر رہا تھا..... نصیرہ بیگم کا چہرہ.....

نور افشاں نے کچھ رسمیں کیں..... چاند میاں نے جو منگنی ٹوٹنے کے بعد سے خود کو گنہگار تصور کر رہے تھے۔ خوب خوش ہو ہو کر ہر زاویے سے دلہن بھابی کی تصویریں بنائیں۔ رات کے پونے دو بج رہے تھے جب اسد نے کمرے میں قدم رکھا۔ انھیں اپنی..... انوکھی شادی بہت پسند آتی تھی۔ ڈھیروں ڈھیر مصنوعی پن سے پاک.....

بھابی اسے چوکنا کر گئی تھیں..... وہ رخ موڑے سانس روکے بیٹھی تھی..... گویا اسد نہ ہوں ملک الموت ہوں.....

''دیکھیں جی..... ایک شرط پر آپ کو ایک خوشخبری سنائیں گے..... وہ یہ کہ آپ نظریں اٹھا کر ایک نظر ہماری جانب دیکھ لیں۔ یہ مت سمجھئے گا کہ ہم اپنی خوبصورتی و دلکشی کی داد چاہ رہے ہیں..... وہ تو آپ اب ساری عمر ہی دیتی رہیں گی..... بس ایک درخواست ہے پلیز.....''

اسد کی بھاری جذبات سے لبریز آواز نے اس کا تنفس تیز کر دیا۔

اگر آپ ہماری درخواست مان لیں تو یقین کریں بہت اچھی خوشخبری سنائیں گے.....''

نیلوفر نے اپنی آنسوؤں سے بھیگی حسین پلکیں ایک لمحے کے لیے اٹھائی تھیں وہاں آنکھوں میں جانے کیا تھا..... وہ تاب نہ لا سکی تھی..... فوراً پلکوں کی جھالر گرا لی تھی۔

''شکریہ.....!'' اس کی نظریں شوخی سے مسکرا رہی تھیں۔

''خوشخبری یہ ہے کہ ہم آپ کو ''ہلالِ جرأت'' دے رہے ہیں۔ ہم جلدی میں غسل تک بھول گئے تھے کہ بڑا سخت پروٹوکول تھا لیکن یہ تمغہ امتیاز با الفاظ دیگر یہ ''ہلالِ جرأت'' لینا نہیں بھولے۔''

نیلوفر نے بے ساختہ نظریں اٹھا کر اسد کی سمت دیکھا۔ ان کی انگلیوں کے بیچ چاند تارے کے ڈیزائن کا چھوٹا سا ٹیکہ جھول رہا تھا۔

اس نے نظریں واپس موڑ لیں۔ اسد نے سر سے ساڑھی کا آنچل کھسکا کر ٹیکہ اس کی پیشانی پر سجا دیا.....

''آپ جانتی ہیں نیلوفر..... آج ہماری زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری ہوئی

ہے خواہ کسی طرح..... آپ ہی کے حوصلوں سے سہی.....'' وہ شرارت سے مسکرائے۔

اور نیلوفر کا خون جیسے اُبل پڑا..... اس نے پاؤں نیچے لٹکا کر آہستہ سے کہا.....

''آپ ہوں گے خوش..... میں تو نہیں ہو سکتی''

''وہ کیوں.....؟'' انھوں نے کوٹ اتارتے ہوئے حیرانی سے پوچھا.....

''آپ کی شادی پر آپ کی امی آپ سے ناراض ہوتیں تو پتا چلتا.....'' اس کی آواز پر آنسو غالب آ گئے۔

''بھئی یہ تو آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھا.....'' اسد نے پھر شوخ انداز میں چھیڑا۔

''میں نے ان سے کچھ نہیں کہا تھا..... پتا نہیں آپ کیا سمجھ رہے ہیں.....'' اس نے رومال سے آنکھیں صاف کیں.....

تب اسد سنجیدہ ہو گئے.....

''نیلوفر..... آج ہماری نئی زندگی کی ابتدا ہے قطعی غیر متوقع سہی..... لیکن ہمیں شروعات سچ اور اعتماد سے کرنا چاہیے..... ابھی تک تو سب مذاق تھا..... لیکن یہ میرے ذہن میں تھا کہ میں تم سے حقیقت ضرور معلوم کروں گا۔ ہو سکتا ہے بات مجھ تک صحیح صورت میں نہ پہنچی ہو..... ٹھیک ہے ناں.....؟

کیا تم مجھے بتاؤ گی کہ حقیقت کیا ہے.....؟''

وہ قمیص کے اُوپری بٹن کھولتے ہوئے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئے.....

تب اس نے ناک آنکھ پونچھتے پونچھتے حرف حرف بتا دیا۔ بالکل سچ.....

اسد منہ میں سگریٹ دبائے چھکا چھک دھواں چھوڑ رہے تھے..... جیسے گہری سوچ میں ہوں۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا نیلوفر..... فکر نہ کرو..... میرا خیال ہے۔ میں ''تم'' سے مخاطب ہو کر غلطی نہیں کر رہا ہوں۔ ''آپ'' میں بہت فاصلے ہیں..... جب سے افشاں بھابی نے آ کر وہ بری خبر سنائی تھی۔ بھئی میں تو زندگی ہی سے بیزار ہو چلا تھا.....''

وہ اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھے..... وہ بدک کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی..... اسد نے متردد انداز میں اس شعلہ قامت کو دیکھا۔ جو اپنے سفید سفید سے بدن کو جو بلاؤز کی حدود سے باہر تھا غیر ارادی طور پر ساڑھی سے ڈھانپنے کی کوشش کر رہی تھی..... افشاں بھابی

نے زبردستی جو سرخ لپ اسٹک لگا دی تھی وہ ہونٹوں کے کناروں کو پار کر کے آس پاس کے رقبے میں پھیل چکی تھی۔ غالباً ہونٹ چبانے کی وجہ سے.....

''یہ کیا ہے نیلو؟ یہ تو قسمت کی مہربانی ہے کہ تم میری ہو چکی ہو..... اس وقت جبکہ مایوسی کے اندھیرے ہر سمت پھیل چکے تھے..... تم بیٹھتی کیوں نہیں.....؟'' انھوں نے اس کے مقابل کھڑے ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکا.....

اس نے رُخ موڑ لیا..... ''مم..... میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک امی جان مجھ سے اپنی خفگی ختم نہیں کر دیں گی..... میں زندگی کی کسی خوشی میں حصہ نہیں لوں گی..... خاص طور پر وہ خوشیاں جو آپ کی ذات یا اس گھر سے وابستہ ہوں.....'' وہ ماں کا پُرجلال چہرہ تصور میں لا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''آپ کو پتا ہے انھوں نے رخصتی کے وقت مجھ سے کیا کہا تھا.....؟'' اس نے اپنی ناک رگڑی.....

''کیا کہا تھا.....؟'' اسد اس کے نزدیک آ گئے.....

''انھوں نے کہا تھا..... تم میرے لیے اور میں تمھارے لیے مر چکی.....''

وہ ہچکیاں لے کر رو دی..... اسد نے واقعی اس کی اشکباری کو اس کے بے پناہ دکھ کا اظہار سمجھا..... وہ خود بھی بے حد سنجیدہ ہو گئے.....

''ٹھیک ہے نیلو..... تم اپنی جگہ برحق ہو..... میں کوشش کروں گا تمھیں زندگی کی خوشیاں حقیقی انداز میں ملیں..... بہرحال تم نے قسم کھا کر اچھا نہیں کیا کم از کم میرے ساتھ.....'' انھوں نے سگریٹ کا ٹکڑا جھٹک کر ایش ٹرے میں مسلا.....

''ماں کی خفگی دیرپا نہیں ہوتی..... بہرحال..... لگتا ہے مجھے تقدیر خوشیاں قسطوں میں دے گی.....'' انھوں نے وارڈ روب سے اپنا نائٹ ڈریس نکالا پھر اس کی طرف پلٹے.....

''نیلو..... تمھیں ان کپڑوں میں تکلیف ہو رہی ہو گی..... یہ بھابی تمھارے لیے رکھ گئی ہیں۔

نیلو..... میں حقیقی جذبے رکھتے ہوئے مصنوعی الفاظ نہیں بول سکتا..... اس لیے میں زیادہ دیر تک تمھیں ''آپ'' سے مخاطب نہ کر سکا..... اُمید ہے خیال نہیں کرو گی.....''

وہ لباس تبدیل کر کے آئے تو وہ بھی جرسی کپڑے سے تیار شدہ بڑی ''شائستہ''

سی نائٹی پہن کر جھجکتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کھڑی ہوئی..... زیور دراز میں ڈالے..... ٹشو پیپر سے لپ اسٹک صاف کی..... اور صوفے پر کشن سر کے نیچے رکھ کر..... لیٹ گئی..... نصیرہ بیگم بدستور اس کے اعصاب پر سوار تھیں.....

''اتنی سخت گیر ہیں امی جان..... لیکن سب سے زیادہ وہ رعایت میرے ساتھ ہی کرتی تھیں..... اسے یاد تھا جب وہ بہت چھوٹی تھی..... ارجمند اور تاجور اپنے مطالبات اس کے ذریعے ہی ماں تک پہنچاتی تھیں کہ اس کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات نصیرہ بیگم پر ٹھنڈے چھینٹوں کا اثر کرتی تھی۔ صورت و عادت بھی بے حد موہنی..... اور ہاں میں ہاں ملانے کا سادہ سا انداز جب سب ماں کو تنہا چھوڑ کر جا چکے تھے ایسے میں ماں کی تنہا رفیق..... ارجمند اور تاجور تو کبھی کبھی ماں پر اپنی جھنجھلاہٹ ظاہر کر دیا کرتی تھیں..... لیکن نیلوفر نے ان سے کبھی اختلاف ظاہر نہیں کیا تھا۔ شاید اسی وجہ سے انھیں آج اس قدر غصہ آیا تھا۔

وہ سوچتے سوچتے جانے کب سو گئی تھی.....

اسد نے کتاب سائیڈ ٹیبل پر ڈالتے ہوئے اس کی سمت دیکھا..... ہتھیلی رخسار کے نیچے رکھے وہ کسی ریاست کی وہ مظلوم و معصوم سی شہزادی لگ رہی تھی جو بدنصیبی سے دیو کی قید میں آ جاتی ہے۔ جسے دیو باہر جاتے طلسم کی مدد سے سلا جاتا ہے۔

مبادا شہزادی نجات کی کوشش نہ کرے..... ایسی ہی بے خبر شہزادی کا تصور اسے دیکھ کر ابھرا تھا.....

وہ اٹھ کر اس کے نزدیک آ گئے.....

''قسم تم نے کھائی ہے نیلو میں نے تو نہیں..... ظالم.....''

وہ نیند میں ذرا کی ذرا کسمسائی اور پھر بے خبر ہو گئی..... اسد نے لائٹ بجھا دی اور بددلی سے بستر پر آ گئے.....

اگلے روز جب کہ وہ جاگی بھی نہیں تھی گھر میں ہنگامے اُبل پڑے تھے۔ تاجور اور ارجمند بھی آ گئی تھیں..... افشاں نے آ کر اُسے جگایا تھا۔

اُسے صوفے پر بے خبر سوتے دیکھ کر انھوں نے تعجب سے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے بال بناتے اسد کو دیکھا..... مگر کچھ بولیں نہیں.....

''نیلو..... اُٹھو چندا.....'' انھوں نے پیار سے جگایا..... اس نے نیند بھری

آنکھوں سے افشاں کو دیکھا۔ تھوڑی دیر تک سمجھ ہی نہ آئی کہ وہ کہاں ہے۔ پھر سامنے نکھرے نکھرے سے اسد کو دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی.....

اسد باہر نکل گئے.....

''میرے لاڈلے دیور نے تمھارے ساتھ یہ زیادتی کیوں کی.....؟'' ان کا اشارہ اس کے صوفے پر سونے کی طرف تھا۔

اس نے کچھ جواب نہ دیا..... بس بیٹھی پلکیں جھپکاتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد تیار ہو کر اس کو پُراہتمام ناشتے کی میز پر لایا گیا..... اسد نے چور نظروں سے اُسے دیکھا پھر بے نیازی سے ناشتے میں مصروف ہو گئے۔

ناشتے کے بعد تاجور اسے اپنے ہاں لے آئیں..... شاہانہ جو مایوں بیٹھی ہوئی تھی اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی اور بے ساختہ اس سے لپٹ گئی.....

''بدتمیز..... ایسی جلدی دکھائی..... ذرا صبر نہ ہو سکا.....'' اُس نے سرگوشی کی.....

وہ مسکرا دی..... ''نمبر بنانا چاہ رہی ہوگی کہ شاہانہ سے سینیر ہو جاؤں.....'' اس نے پھر اس کے کان میں کہا۔

وہ بیٹھی ہاتھ مسلتی رہی..... پیازی ساڑھی میں بے پناہ سادگی کے ساتھ وہ قطعی دلہن نہ لگ رہی تھی..... دونوں بیٹھی باتیں کرتی رہیں.....

''یہ تو بتا..... کیا پایا.....؟'' شاہانہ نے اس کے سراپے پر کھوجتی نظر ڈالی.....

''ہلالِ جرأت.....'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولی..... اور پرس میں سے ٹیکہ نکال کر اس کے سامنے کر دیا.....

شاہانہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی.....

''ارے بڑے قدردان ہیں یہ اسد بھائی.....!'' اس نے ٹیکہ اٹھا کر دلچسپی سے دیکھا.....

''اور یہ بتا..... انھوں نے پوچھا تو ہوگا اس ''ایمرجنسی'' پر.....؟''

''ہوں پوچھا تو تھا..... ویسے بھابی انھیں بتا چکی تھیں۔ تب ہی تو یہ ہلالِ جرأت.....'' اس نے منہ موڑ کر مسکراہٹ چھپائی۔

شاہانہ ایک مرتبہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی.....

''ارے شاہانہ..... کیا بات ہے کیا لطیفے سنا رہی ہے نیلی؟'' تاجور گود کے بیٹے کو اٹھائے ہوئے بہلاتی ہوئی ان کے قریب آ گئیں۔

''بس بھابی..... کچھ مت پوچھیں..... وہ.....'' شاہانہ نے بمشکل ہنسی روکی.....

نیلو نے اس کا ہاتھ دبا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا.....

''اور سناؤ..... کیا حال ہیں بیگم اسد.....؟'' تاجور شوخی سے مسکرائیں.....

وہ نظریں جھکا کر رہ گئی ''آپی..... امی تو آئیں گی نا کل..... شادی میں.....؟''

''شاید.....!'' انھوں نے بیٹے کی پیشانی سے بال سمیٹ کر غیر یقینی جواب دیا.....

''پاگل ہے نیلی تو..... کب تک ناراض رہیں گی امی جان۔ فکر نہ کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جب صحیح بات منہ سے نکال دیتے ہیں۔ تو پچھتاتے نہیں ہیں..... میں تو بہت خوش ہوں۔ خواہ لوگ کچھ بھی کہتے رہیں..... بے کار کا نصیحتہ تھا..... امی جان کی تھانیداری دوسروں کے جذبات نہیں دیکھتی..... ہر بات اپنی آن پر لے لیتی ہیں..... ٹھنڈے دل سے سوچیں تو کوئی بات ہی نہیں تھی جس کے لیے کل انھوں نے یہ ڈرامہ کیا..... میں تو کہتی ہوں اچھا ہوا.....''

نیلوفر کو تاجور کے سکون و اطمینان پر رشک سا آیا۔ جب کہ وہ بہت بے چین تھی۔

آج شاہانہ کی مہندی تھی..... جس میں شرکت کے لیے وہ تڑپ رہی تھی..... سہ پہر کو افشاں بھابی آ گئیں..... اور کہنے لگیں۔

''ذرا نیلو کو بازار لے کر جا رہی ہوں۔ مہندی شادی ولیمے کے لیے کچھ کپڑے خریدنے ہیں اور ضروری چیزیں..... اور جو جوڑے خالہ جان نے دیے ہیں درزی کو دے آئیں چلو نیلو..... شاباش اٹھو ورنہ دیر ہو جائے گی.....''

وہ تاجور کی کریم کلر کی چادر لپیٹ کر باہر آئی تو ڈرائینگ سیٹ پر چاند میاں بیٹھے تھے.....

نیلو کو دیکھ کر شوخی سے مسکرائے۔ وہ بھی جھینپ کر مسکرا دی۔

''لگتا ہے..... اسد بھائی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوا۔ بڑے بجھے بجھے سے ہیں۔ جب ہی تو خود آنے کے بجائے مجھے بھیج دیا..... میں نے کہا ٹھیک ہے ''مجرم'' ہیں..... پورا پورا تاوان ادا کریں گے.....''

''چپ کر شریر..... وہ کیوں بجھا بجھا ہوگا..... یہ بھی خوشی چھپانے کا انداز ہے.....''

انھوں نے دروازہ کھول کر نیلوفر کو بٹھایا پھر خود بھی اس کے برابر میں بیٹھ گئیں۔

''سب سے پہلے ''فارٹوڈے'' بوتیک پر گاڑی رکوائی..... اور ایک مہندی کلر کا خوبصورت کرتے پائجامے کا سوٹ لیا۔ سلک کا چم چم کرتا پائجامہ اور مہندی رنگ اور سنہری رنگ کی آمیزش سے بنی جالی کا کرتا..... جس پر خوبصورت ٹشو کا ڈوپٹہ اپنی بہار علیحدہ دکھا رہا تھا۔

کپڑوں کے بعد ہمرنگ چیزوں کا انتخاب شروع ہوا۔ وہ واپس اسے تاجور کے ہاں چھوڑ گئیں..... اس سلسلے میں تاجور نے انھیں پہلے ہی تاکید کر دی تھی۔

وہ تھک کر چورم چور ہو رہی تھی آتے ہی شاہانہ کے کمرے میں پڑ کر سو گئی۔

کہیں جا کر مغرب کے بعد آنکھ کھلی..... باہر سے ڈھولک گیتوں کی آوازیں آ رہی تھیں..... شاہانہ بھی کمرے میں نہیں تھی۔ اس نے اٹھ کر غسل کیا اور شاہانہ کا سوتی سوٹ پہن کر باہر آ گئی۔

ابھی بال سکھا ہی رہی تھی کہ تاجور آ گئیں.....

''ارے..... تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں دولہا والے آتے ہی ہوں گے..... چلو شاباش تیار ہو جاؤ'' وہ عجلت میں پھر باہر چلی گئیں.....

اس نے دیکھا..... شاہانہ نے ان کی ہر چیز تیار کر کے رکھ دی تھی..... اسے شاہانہ پر ٹوٹ کر پیار آ گیا..... کس قدر چاہتی ہے۔ شاہانہ مجھے..... اس کی چاہت نے تو مجھے آج یہ دن دکھائے۔'' وہ مسکرا دی..... بڑے پھیکے سے انداز میں.....

وہ تیار ہو رہی تھی کہ تاجور اپنا ایک سیٹ لیے آ گئیں۔

''لو یہ پہن لو..... ہلکا سا ہے اچھا لگے گا اس سوٹ پر..... اور یہ لفافے میں موتیے اور گلاب کی کلیوں کا گجرا ہے۔ ضرور لگا لینا۔''

پھر جاتے جاتے پلٹ آئیں۔ ''میرا خیال ہے ولیمہ یہ لوگ کچھ دن بعد کریں گے۔ کیوں؟''

''مجھے تو کچھ پتا نہیں.....'' اس نے گم سم سے انداز میں زیور کا ڈبہ کھولتے ہوئے جواب دیا۔

نازک سا گلوبند اور چاند بالیاں تھیں۔ اس نے زیور پہن کر بائیں جانب بالوں

میں کلیوں کا گجرا اٹکا لیا۔ اسی وقت دھڑ سے دروازہ کھلا۔

''ماشاء اللہ چشم بددور۔'' افشاں وہیں کھڑے کھڑے مبہوت سی ہو کر بولیں۔

''یہ چوڑیاں تو گاڑی میں ہی رہ گئی تھیں نیلو..... آؤ ڈرائینگ روم میں چلتے ہیں۔ وہیں پہنا دوں گی۔ وہاں ایئر کنڈیشنر آن ہے۔ ادھر تو حبس سا ہو رہا ہے۔'' وہ اسے لیے ہوئے ڈرائینگ روم میں چلی آئیں اور ایک صوفے پر ساتھ بٹھا کر بڑی مہارت سے اس کی کلائی میں چوڑیاں ڈالنے لگیں۔

''بھابی یہ اسد بھائی آ گئے۔'' شاہانہ سے چھوٹی عرفانہ نے ہانک لگائی۔ نیلو نے سر اٹھا کر دروازے کی سمت دیکھا آف وہائٹ بوسکی کے کرتے اور سفید تنگ پائجامے میں اسد کھوئے کھوئے سے بہت اچھے لگے۔

بھابی نے ایک نظر دیکھ کر دوبارہ اپنی توجہ چوڑیوں پر مرکوز کر لی۔

''اچھا ہوا اسد تم آ گئے۔ میں چاند میاں سے کہہ کر آئی تھی..... بات یہ ہے کہ لڑکیاں زیادہ ہیں اِدھر اور ''سواریاں'' کم..... چاند میاں تو چچا میاں (تاجور کے سسر) کی گاڑی ہانکیں گے۔''

وہ رک کر ہنسیں اور بڑی احتیاط سے چوڑیاں کلائی کی طرف دھکیلیں۔

''تم اپنی گاڑی لے آنا..... ٹھیک.....؟ بھائی میاں تو تمھارے کسی دوست کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔ سو مت جانا.....''

انھوں نے اس کے دوسرے ہاتھ میں چوڑیاں چڑھانا شروع کر دیں۔

''اور ہاں..... زینب سے کہہ دینا کھانا کھلا دے گی تمھیں۔''

''ارے بھابی، زینب کھانا کھلاتی ہے اسد بھائی کو۔'' عمرانہ نے شرارت سے بات پکڑی۔

''چپ بدتمیز..... لے آئی ہوں میں اپنے دیور کے لیے کھانا کھلانے والی۔ آج کی بات ہے بس۔''

انھوں نے مسکرا کر نیلو کو دیکھا۔ اتنی ساری نظریں مع اسد کی نظروں کے خود پر ٹکی دیکھ کر وہ نروس سی ہو گئی۔

''بھابی! وہ سعدیہ ہے نا میری دوست کہہ رہی تھی کہ تم لوگ کل کہاں چلے گئے

تھے۔ میں نے کہا..... کہ ہماری کزن ضد کر کے بیٹھی تھیں کہ ''پہلے میں۔'' اس لیے پہلے انھیں فارغ کرنے گئے تھے۔''

فلک شگاف قہقہے بلند ہوئے۔ نیلوفر کو اپنی عجیب سی توہین محسوس ہوئی۔

اس نے اسد کی سمت دیکھا جو سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے برابر اسے دیکھ رہے تھے۔ اسے متوجہ دیکھ کر نظریں چرا گئے۔

اسی وقت دولہا والوں کی آمد کا غلغلہ اٹھا۔ اسد واپس گھر چلے گئے۔

رات تقریباً ساڑھے گیارہ بجے جب وہ دولہا والوں کے ہاں مہندی لے جانے کے لیے سب کے ہمراہ باہر نکلی تو عمرانہ نے شرارت سے ایک گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے دھکیل دیا۔

اندر اسٹیئرنگ پر بازو جمائے اسد بیٹھے تھے۔ خوشبوؤں میں بسی نیلوفر کو دیکھ کر انھوں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''کسی کی قوتِ برداشت آزمانا سخت گناہ ہے۔ میں تمام رات جاگ کر دعا کروں گا کہ خالہ جان کل شادی میں آ جائیں اور خفگی ختم کر دیں۔ تاکہ.....'' انھوں نے جھک کر سگریٹ سلگایا۔

''اتنی سگریٹ پیتے ہیں۔ نقصان دیتی ہے۔'' اس کے منہ سے نکل گیا۔

''مثلاً.....؟'' انھوں نے سارا دھواں اس پر چھوڑ دیا۔

''خون ہی جلاتی ہوگی.....'' اس نے دھوئیں کو ہاتھ سے ہٹانا چاہا۔

''تمہارا نام تو ''سگریٹ'' نہیں۔ یہ کام تو تم بھی کرتی ہو۔'' وہ مسکرائے۔

وہ لاجواب سی ہو کر باہر دیکھنے لگی۔

.....✿.....

سات ماہ گزر گئے تھے۔ پتا بھی نہ چلا۔ رمضان کا آخری عشرہ چل رہا تھا۔

نصیرہ بیگم شاہانہ کی شادی میں شریک نہ ہوئی تھیں بلکہ اپنے بھائی کے ہاں نواب شاہ چلی گئی تھیں۔

تاجور اور ارجمند نے کس قدر کوششیں کی تھیں انھیں منانے کی بالکل پتھر ہو گئی تھیں.....

افشاں جانتی تھیں کہ وہ ماں کی وجہ سے کس قدر پریشان رہتی ہے..... اس لیے کبھی تاجور کے ہاں بھیج دیتیں کبھی ارجمند کے ہاں.....

کوئی مہینہ تاجور کے ہاں گزارا کوئی ارجمند کے ہاں، وقت کا پتا ہی نہ چلا.....

ایک روز تاجور نے بتایا تھا کہ اسد امی جان کے پاس اکثر جاتے ہیں۔ اسے بہت خوشی سی ہوئی تھی.....

اس نے جھجکتے ہوئے اسی رات تصدیق چاہی تو انھوں نے اس کی جانب نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا تھا۔

''بھئی..... میری تو وہ ساس ہیں..... اور میری کسی حرکت کی وجہ سے ناراض بھی نہیں ہیں۔ خفگی ان کی تم سے ہے مجھ سے تو نہیں میری تو وہ اتنی ہی عزت افزائی کرتی ہیں جتنی دوسرے دامادوں کی کرتی ہوں گی.....''

''آپ نے مجھ سے کیوں چھپائی یہ بات.....؟'' وہ شکوہ کناں ہوئی.....

''یہ سوچ کر کہ تم زیادہ بے چین ہو جاؤ گی.....''

''آپ نے ان سے کہا نہیں کہ.....'' اس کی آواز پر آنسو غالب آ گئے۔

اسد کو واقعی اس پر ترس سا آ گیا..... ان کا جی چاہا وہ اسے قالین سے اٹھا کر اپنے دل میں چھپا لیا۔ لیکن وہ ان کی ہوتے ہوئے بھی ان سے بہت دور تھی..... کسی احمقانہ سی قسم کے شکنجے میں کسی ہوئی.....

کتنا سمجھایا تھا کہ ان قسموں کی کوئی ویلیو نہیں ہوتی۔ مت کرو یہ ظلم۔ جو دوسروں کو ناحق تنگ کرتے ہیں خدا انھیں معاف نہیں کرتا۔ ایک محبت کا دروازہ خود بخود بند ہوا۔ دوسرے پر تم نے خود قفل چڑھا دیے۔

''کیا آپ مجھ سے نفرت کرتے ہیں.....؟''

''شاید.....'' انھوں نے کتاب چہرے کے سامنے کر لی۔

''بات سنیں۔'' وہ مزید پریشان ہو گئی۔

''سناؤ.....''

''آپ امی جان سے کہیے نا کہ میں ہر وقت روتی رہتی ہوں آپ کی بات شاید اثر کر جائے ان پر..... ارجمند اپیا اور تاج آپی نے تو بہت کہا۔''

''پھر.....؟''

''پھر کیا۔ وہ کہتی ہیں جس دن میں نے ولیز پر قدم رکھا۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''میرے ایک جملے کی اتنی بڑی سزا۔'' اس نے اشک پونچھے۔

''وہ جملہ نہیں تھا علم بغاوت تھا۔ یعنی عید کے جوڑے کی اہمیت سے انکار کر کے تم نے ان کی بات کو بے وقعت ثابت کیا تھا.....''

''اور جس کے لیے کیا تھا وہ.....''

''وہ ''ہلالِ جرأت'' دے چکے ہیں۔'' اسد نے بات کاٹ کر اس کے پریشان چہرے کی طرف مسکرا کر دیکھا.....

''آپ کو تو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔ اگر آپ چاہتے تو.....''

''سچ نیلو..... میں نے بہت سے بہانوں سے یہ بات ان تک پہنچائی.....''

''ایک روز کہنے لگیں۔ اسد میاں اگر دامادوں کی بیٹیوں کی طرح بلکہ بیٹیوں سے زیادہ عزت کرنا ہمارے خاندان کی روایت نہ ہوتی تو وہ پہلی مرتبہ ہی مجھے دروازے سے واپس کر دیتیں..... میں اتنی جلدی جلدی اگر جاتا ہوں تو تمہاری وجہ ہی سے جاتا ہوں۔

ایک روز کہنے لگیں..... خاندان بھر کم ذاتوں کی طرح تھالی کا بینگن ہو چکا ہے۔ لیکن میں اپنے اصول و روایات نہیں چھوڑ سکتی۔ ارے میرے فیصلے کے خلاف تو کبھی میرے شوہر بھی نہ بولے اور وہ کل کی لڑکی.....''

''وہ نہیں مانیں گی چاہے میں مر ہی کیوں نہ جاؤں۔'' وہ روتی ہوئی باتھ روم میں گھس گئی..... اسد نے اس کا دکھ اپنے دل میں محسوس کیا تھا..... (میں بے حد کوشش کر رہا ہوں نیلو)

چاند رات کو وہ بھابی..... بھائی میاں..... چاند و اسد کے ہمراہ خوش نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اندر دل رو رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے لیے تاج کے ہاں بھی ہو آئی کہ بہن کی..... صورت دیکھ کر ہی کچھ سکون ملے گا لیکن وہاں بھی دل نہ لگا..... جلد ہی اٹھ کھڑی ہوئی.....

''کہاں.....؟'' تاج نے حیرانی سے دیکھا۔

''بس آپی..... گھر چلتی ہوں..... چاند میاں سے کہیے..... چلیں.....''

بغل میں ہی بہن کا گھر تھا مگر وہ وہاں بھی کبھی تنہا نہیں آئی تھی..... کہ ماں کے سامنے تو امیج بگڑ چکا ہے کم از کم سسرال میں تو بنا رہے.....

گھر آئی تو بھابی کے ساتھ کام میں مگن ہوگئی۔ لیکن دل بہت بے چین تھا.....

اسد باتھ روم میں تولیہ لٹکانے آئے تو وہ دیوار سے لگی آنسو بہا رہی تھی۔

''نیلو.....!''

''جی.....؟'' وہ بوکھلا سی گئی ''کیوں اس قدر پریشان ہوتی ہو سب ٹھیک ہو جائے گا.....'' وہ رُخ موڑے اشک پونچھتی رہی.....

''چلو تیار ہو جاؤ..... بازار چلتے ہیں..... چلو..... شاباش..... بھئی..... بات ماننی ہوگی.....''

وہ تیار ہونے لگی.....

''ارے نیلو کہاں ہو بھئی..... تمھارے بھائی میاں بازار سے آ گئے ہیں..... عید مبارک..... لو اور دو.....'' افشاں! اُسے پکارتی ہوئی چلی آئیں.....

وہ سر پر آنچل ڈال کر جیٹھ کے سامنے چلی آئی.....

''آداب بھائی میاں..... عید مبارک.....''

''عید مبارک بھئی..... خوش رہو.....'' انھوں نے سرخ نوٹ بطور عیدی اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

اُسی وقت اسد آ گئے۔

''بھابی! ہم ذرا بازار تک جا رہے ہیں۔'' اسد نے ریسٹ واچ کلائی پر باندھتے ہوئے بتایا۔

''ہاں بھئی ضرور جاؤ.....''

اسد اُسے لیے ہوئے نزدیکی شاپنگ سینٹر چلے آئے..... یہ روشنیاں..... وجیہہ جیون ساتھی کی رفاقت..... کوئی شے اس کا دل نہ بہلا پائی.....

ایک گھنٹے بعد وہ واپس ہو رہے تھے..... اسد غیر معمولی طور پر خاموش سے تھے۔ خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتے رہے۔ گاڑی دھچکے سے رکی تو وہ چونکی۔ کار اس کے میکے کی ڈیوڑھی سے لگی ہوئی تھی۔

''اُترو!'' اسد نے اتر کر اسے بھی باہر آنے کو کہا۔

''اسد.....!'' اس کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ ''بھئی میں امی جان کو اُن کا احسان واپس کرنے آیا ہوں۔ وہ چیز جو نہ میری ہے نہ ان کی۔ یہ ادھورا سا روگ انہی کو مبارک.....'' وہ کھڑے ہوئے سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

''اترو بھئی.....'' وہ لرزتی ہوئی اتر آئی۔

''چلو۔''

''مم..... میں نہیں جاؤں گی۔ وہ کچھ کر بیٹھیں گی..... آپ دیکھ لیجیے گا۔''

''مجھے نہیں معلوم۔ جب ماں کا دل اتنا سخت ہو سکتا ہے تو میں کس طرح قابل بھروسہ ہو سکتا ہوں..... وہ تمھارے خون میں جذب ہیں اور اتنی بے نیاز ہیں۔ پھر میرے تمھارے درمیان تو محض زبانی و کاغذی رشتہ ہے۔ چلو آؤ بھئی۔''

اسد کا لہجہ ہر تاثر سے عاری تھا..... اس اچانک افتاد نے تو رہی سہی توانائی بھی چھین لی تھی وہ بمشکل اتر آئی۔

اسد نے دستک دی۔

چند ہی لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ سامنے ڈھانچہ سی نصیرہ بیگم کھڑی تھیں۔

اسد نے سلام کیا۔ جواب میں انھوں نے دعائیہ کلمات کہے اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ کار سے لگی لرز رہی تھی۔

دونوں اندر چلے گئے تو اس نے قدم اٹھائے۔

نصیرہ بیگم اسے دیکھ کر ذرا نہ چونکیں۔ تب وہ دیوانہ وار بھاگ کر ان سے لپٹ گئی اور تڑپ تڑپ کر رو دی۔ وہ چند لمحے تو ساکت کھڑی رہیں پھر ضبط نہ کر سکیں..... اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا..... اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

''اولاد کو ماں باپ کی کمزوری کا پتا ہوتا ہے اس لیے بعض اوقات بہت ستاتی ہے۔''

''امی مجھے پتا ہوتا کہ میری وہ بات اتنی بڑی قیامت لے آئے گی۔ مجھے معاف کر دیں..... امی..... رو رو کر میری آنکھیں خشک ہو گئیں..... آپ کو رحم نہ آیا۔'' وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

''کیوں نہیں آیا۔ بہت آیا۔ اسد میاں آتے رہتے ہیں سب کچھ بتا دیتے تھے۔

میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں نیلی۔ میری ہاں بھی ایک مرتبہ..... ہوتی ہے اور نا بھی۔''

ان کے انداز میں بے بسی تھی..... حالانکہ اس کی وجہ سے بہت دکھ بھی اٹھائے میں نے..... اسد میاں بہت اچھے ہیں نیلی..... اب میں خوش ہوں کہ تو نے ایک جملے کے عوض، اتنا اچھا داماد دیا۔''

''پھر آپ نے مجھے معاف کیوں نہیں کیا تھا.....؟''

''تو آئی تھی معافی مانگنے.....؟''

''آپ ہی تو سب سے کہتی تھیں کہ.....''

''کہتی تھی ناں۔ ایک بات کہنے کی عادت جو ہے۔ تو آ کر تو دیکھتی..... جیسے آج آئی ہے۔''

''میں ڈر کے مارے آج بھی نہ آتی۔ یہ تو.....'' اس نے اسد کی سمت دیکھا۔

''اسد میاں.....!''

''جی خالہ جان.....!''

''دیکھو بیٹا..... آج تو تم نے اس کوسخت دل ماں کا طعنہ دیا۔ آج کے بعد.....''

''تو گویا آپ نے سُن لیا.....'' وہ بناوٹی شرمندگی سے بولے..... حالانکہ وہ انھیں کھڑکی میں کھڑا دیکھ چکے تھے۔ انھوں نے انھیں صبح اطلاع کر دی تھی کہ وہ رات تک آئیں گے۔

''میں شرمندہ ہوں۔'' وہ بناوٹ سے بولے اور باہر چلے گئے..... پھر ایک بھاری سا پیکٹ لے کر اندر آئے۔

نصیرہ بیگم مٹھائی لینے باورچی خانے میں چلی گئی تھیں۔ واپس آ کر تعجب سے پوچھا۔

''یہ کیا ہے؟''

''عید کا جوڑا..... وہ اطمینان سے بولے۔

''عید کا جوڑا۔ اے ہے۔ مگر کس کا؟'' وہ متعجب ہوئیں۔

''آپ کا۔''

''ہائیں۔ تم کس رشتے سے مجھے عید کا جوڑا دے رہے ہو۔''

''بیٹے کے رشتے سے..... اور مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولے۔

''عید کے جوڑے کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔''

''طعنہ دے رہے ہو.....؟'' وہ رنجیدہ ہو گئیں۔

''خدانخواستہ خالہ جان.....'' وہ گھبرا گئے۔ ''یہ تو میری خوشی ہے۔ یہی جوڑا پہن کر آپ ہماری دعوتِ ولیمہ میں شرکت کریں گی۔''

''دعوتِ ولیمہ.....'' وہ حیران ہوئیں۔

''جی خالہ جان.....'' انھوں نے بھی ایک قسم کھائی تھی اور میں نے بھی کہ ساس کے بغیر ولیمہ نہیں کروں گا۔ باہر سے ڈھول ڈھماکوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ نیلو نے جلدی سے گھبرا کر بات پلٹی۔

''یہ کیسی آوازیں آ رہی ہیں.....؟''

''مجھے تو ''ہڈیاں'' ٹوٹنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔'' اسد نے کرسی کی پشت سے ٹیک کر شرارت سے کہا تھا۔

✿.....✿.....✿

ہماری اماں

''ہئی ہئی حرام خور! یہ کیا کیا؟'' اماں بُری طرح چنگھاڑیں۔

''خود ہی تو کہا تھا، ہاں نہیں تو۔'' اس نے زردے کے رنگ میں آبالے چاول سفید دوپٹے پر ڈالتے ہوئے بسور کر کہا۔

''اری نامراد! سفید دوپٹے پر کس نے کہا تھا، میں نے تو پیلے دوپٹے پر ڈالنے کو کہا تھا۔ کمبخت نے سارا دوپٹہ خراب کر دیا۔ حرام خور کا دیدہ ہو کام میں تو کرے بھی۔'' اماں نے بے بھاؤ کی سنائیں۔

''جبھی تو کہہ رہی ہوں کہ شیخ صاحب کی بیگم جیسی پانی نچوڑنے کی اسٹیل کی چھلنی منگا لو۔'' اس نے بھی منہ بنا کر کہا۔

''گونر (گورنر) لگ رہا ہے تیرا باپ کہیں کا۔ بیٹھے بٹھائے باتیں ہی سوجھتی ہیں۔ چل ہٹ دفع ہو، کرواؤ مہارانی سے کوئی کام۔ لونڈیا بھی دی تو ایسی، اس سے اچھا نہ ہی دیتا خدا۔ حرام خور پر چیخ پکار کرتے حلق بیٹھ جاتا ہے۔ ایسی اولاد سے تو بے اولاد ہی بہتر تھے۔''

''اپنے ہی کرتوت ہیں۔ ہم نے تو ہاتھ نہیں جوڑے تھے۔ اس سڑے سے گھر میں آنے کے لیے۔''

وہ آگ بگولہ سی تل سے ہاتھ دھوتے ہوئے بولی مگر اس سے پیشتر کہ سلسلہ گفتگو جاری رہتا۔ دھپ دھپ اماں نے دو ہتڑ اس کی پیٹھ پر مارے۔ اس کا سر گھٹنوں میں چلا گیا۔ مضبوطی سے تل تھامے وہ پٹتی رہی۔

''بول حرافہ! اتی زبان چل گئی ہے۔ کل کی لونڈیا کیسی منہ کو آ رہی ہے۔''

''اے لماں! چھوڑ دبھی، تم بھی جوان لڑکی پر ہاتھ اٹھاتی ہو۔'' بھابی نے منے کو ''خاص کام'' کے لیے سینے سے لگا کر آنچل سے چھپاتے ہوئے کہا۔

''اے..... ل..... لو دیکھو تو ذرا، کہہ رہی ہے، اپنے ہی کرتوت ہیں بے شرم..... قطامہ..... نہیں تو۔'' اماں بری طرح ہانپ رہی تھیں۔

''محلوں کے خواب دیکھے ہیں، یہ آج کی لونڈیاں۔''

.....✿.....

''اے بہن! دیکھو کس بری طرح پٹتی ہے، مگر کلمہ ماں کا پڑھے گی، بھولے سے ماں کی بُرائی نہیں کرتی، کوئی کر دے تو ہتھے سے اکھڑ جاتی ہے۔ اماں کہتی ہیں۔ اماں بولتی ہیں۔ اماں..... اماں..... اماں۔'' نور خان کی بیوی دیوار سے اترتے ہوئے اپنی جٹھانی سے بولی۔

''اے بھابی ایسے نہیں..... اماں کہتی ہیں کہ بچے کو کلائی سے پکڑ کر نہیں اٹھانا چاہیے، ہاتھ اتر جاتا ہے۔''

اس نے باورچی خانے کے ریک میں دھلے ہوئے برتن سجاتے ہوئے کہا کہ بھابی اپنے منے کے ہاتھوں میں اپنی انگلیاں دے کر اٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''اے ہاں بی! فہم و فراست کا جنم تو تمہاری اماں کے ہاں ہی ہوا ہے، ورنہ تمہاری اماں سے پہلے تو دُنیا بغیر دماغ کی کھوکھلی کھوپڑیاں لیے پھرتی تھی۔'' بھابی نے جل کر سوچا۔

''اے ہاں جو کام بھی کرو یہ بنو ضرور بول دیں گی کہ اماں یوں کہتی ہیں، اماں یہ کہتی ہیں، ساس سے بھی بڑھ کر ہیں یہ تو۔'' بھابی نے پیشانی پر بل ڈال کر اس کی پشت کو گھورا۔ واقعی انھیں اس کی روک ٹوک زہر لگتی تھی۔ اماں نے بھی تو پہاڑ سینے پر رکھا ہوا ہے۔ یہ نہیں کہ کہیں چلتا کر دیں۔

نام تو ان کا انجم آرا تھا۔ جو پہلے نجو..... نجی، اب نجو پر ٹھہر گیا تھا۔ کھری باتیں کہنے کا شوق، جھوٹ سے نفرت، بچوں سے چڑ، گندگی سے چڑ، ہانڈی پکا لیں گی روٹی پکانے پر کوفت کا احساس کپڑا مار کر فرش چمکانا دل پسند مشغلہ، کپڑے دھونے سے الرجی، بال بڑھانے کا شوق، سنگھار پٹار سے بے نیاز، ان سب خوبیوں خامیوں کا مرقع تھی نجو کی شخصیت۔ نویں جماعت میں آئیں تو کہیں سے ''لکیروں کے بھید'' کی کتاب مل گئی۔ بس جہاں اور جب موقع ملتا لڑکیوں کا ایک جم غفیر ان کے پیچھے ہو لیتا۔ بڑے اشتیاق سے ڈھیروں ہاتھ بڑھتے۔

''پہلے ہمارا نجم.....!''

''نجم آراء میری کلاس شروع ہونے والی ہے پہلے میرا۔''

''اللہ بھئی، چپ کرو۔ اگر ہیڈ مس نے دیکھ لیا سب دھر لی جائیں گی۔''

ایک روز میٹرک کی شروع کلاسز تھیں، لڑکیاں نجم آراء کو گھیر کر بیٹھ گئیں۔

''ہمارا ہاتھ دیکھو نجم۔''

''نہیں بھئی، اب ہم نہیں دیکھیں گے۔''

''کیوں؟'' لڑکیوں کی گھبرائی ہوئی آوازیں اُبھریں۔

''بھئی، کل ہماری اماں نے سنا تو بہت ناراض ہوئیں۔''

''کیا کہہ رہی تھیں تمہاری اماں؟'' لڑکیاں چیخیں۔

''اماں کہہ رہی تھیں، ہاتھ دیکھنے اور دکھانے والے کی چالیس روز تک دعا قبول نہیں ہوتی۔ گناہ الگ ہوتا ہے۔'' انھوں نے رسانیت سے کہا۔

اور پھر نجم آراء کو کسی کے بھی دلائل قائل نہ کر سکے۔ اماں کا فرمان جو ٹھہرا۔

.....✿.....

پڑوسن بھابی سے کہہ رہی تھیں ''دلہن! ہوا کا رخ دیکھنا چاہیے۔''

''ہاں خالہ! اماں خود کہتی ہیں جس طرف ہوا ہو، اس طرف جھاڑ نہیں دینا چاہیے۔ سارا کوڑا کرکٹ لوٹ کر اُوپر آتا ہے۔''

بڑی معصومیت سے کہا گیا۔

بھابی نے مارے غصے کے دھپ دھپ کر کے منے کو سلانا چاہا۔ پڑوسن بی بی ہنسی چھوٹ گئی اور بھابی کو بھی بادل ناخواستہ مسکرانا پڑا..... مگر اپنی بات کاری ایکشن دیکھنے کی فرصت کسے تھی۔ سٹر پٹر فرش دھویا جا رہا تھا۔

نجم آراء بڑے انہماک سے گاؤ تکیے کو گول کرنے کے لیے زور زور سے دبا رہی تھیں کہ ان کی سہیلی راشدہ وارد ہو گئیں۔

''ہائے نجو! جتنا دم خم اس تکیے پر لگا رہی ہے، کسی انسان کی مالش پر لگاتی تو تمام عمر دعا ہی دیتا۔''

''آؤ، بیٹھو راشدہ! دراصل اماں کہتی ہیں کہ پچکے ہوئے گاؤ تکیے پھوہڑوں کے

گھر میں ہوتے ہیں۔ اے ہاں یہ بھائی میاں نہ جانے کیسے بیٹھتے ہیں بالکل چپاتی بنا دیتے ہیں اور سناؤ کیسے آئیں؟''

انھوں نے روانی سے کہا تو راشدہ مسکرا دی۔

''توبہ نجو! تیری تو زبان بہت چلنے لگی ہے۔''

''ہاں۔ اماں بھی یہی کہتی ہیں۔'' نجو افسردگی سے بولیں۔

میٹرک کرنے کے بعد تو انجم آراء کو گھر میں ٹکنا دوبھر ہو گیا تھا۔ اماں چیختی رہتیں۔

''اری نامراد! یہ شرفاء کی لونڈیوں کے لچھن ہیں۔ کبھی اس دروازے جھانک کبھی اس دروازے جھانک۔''

''اماں! تمہارا تو مطلب یہ ہے کہ گوند لگا کر کسی کونے میں چپک جائیں۔'' انجم آراء کو تاؤ آ جاتا (حالانکہ بعد میں بڑی جز بز ہوتیں اپنی تنک مزاجی پر)

''اے لوگز بھر کی لونڈیا کیسی منہ کو آتی ہے۔'' اماں بری طرح مشتعل ہو جاتیں۔

''کوئی گز بھر دز بھر کی نہیں ہوں بلکہ دو انچ بڑی ہی ہوں آپ سے۔'' (لو بھئی خواہ مخواہ گز بھر کی کہلائیں یہ کوہ قامت لے کر بھی)

''ایل..... لو سمجھائے کوئی انھیں، جو خود ہماری اماں بن رہی ہیں۔''

اماں بڑبڑائیں ''کہاں تک مار مار کر محلے میں تماشا بنوائیں دس جماعتیں پڑھ کر حواسوں میں نہیں رہی۔'' آخر کار بھابی بیچاری خاموش کراتیں۔

''بھابی ریڈیو کم بجایا کرو۔ اماں کہہ رہی تھیں جہاں چوبیس گھنٹے گانا بجانا ہو وہاں خدا کی رحمتیں نازل نہیں ہوتیں۔''

نجم آراء جھٹ چیختے ریڈیو کا کان مروڑ دیتیں۔ تب بھابی دوبارہ ریڈیو کھولتے ہوئے کہتیں۔

''بس بی بی! ہم بے رحمت ہی بھلے۔ تمھیں مبارک ہوں یہ رحمتیں۔ تمھارے کمرے ہی میں برسے خدا کی رحمت۔

آخر برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔ جو کام کرو یہ بیگم مٹک کر آ جائیں گی وعظ کرنے۔'' اور تب نجم آراء دل ہی دل میں بھابی پر کفر کا فتویٰ دائر کر دیتیں اور کان پکڑتی ہوئی باہر نکل جاتیں۔

''خدا کی رحمت سے منہ موڑنے والا کافر نہیں تو اور کیا ہے۔'' وہ پورا یقین کر لینا چاہتیں کہ وہ صحیح راستے پر ہی ہیں۔

''اے لماں بی! تم ذرا مرزا صاحب کے ہاں تو جاؤ اور ان کے بیٹے کی بھی ویسی ہی ستائی کرو جیسی میری کرتی ہو۔''

''کیوں کیا ہو گیا؟'' لماں نے کڑک کر پوچھا مگر نجو پر ذرا جو اثر ہوا ہو۔

''ان کا لڑکا جاوید ہے نا، آج میں نجو کے گھر سے آ رہی تھی تو شعر پڑھ رہا تھا۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا۔''

نجو نے لہک لہک کر مگر سنجیدگی سے شعر سنایا تو چاول بینتی بھابی توبہ توبہ کرنے لگیں۔

''کتنی بار شعر پڑھا ہے، اس نے کہ تجھے حفظ ہو گیا؟'' لماں نے مشتبہ اور خونخوار نظروں سے گھورا۔

''لو بھلا اِتّا سا تو شعر ہے، یہ تو مجھے پہلے سے آتا تھا اور ہاں گانا بھی گا رہا تھا۔

جوانی کی راتیں میری توبہ۔ توبہ
آگے کا نہ جانے کیا ہوگا؟''

''ہئے ہئے کمبخت تیرا ستیاناس! چلو بھر پانی میں ڈوب کر مر جا، اسی مارے کہتی تھی کہ گھر میں دیدہ ٹکا۔''

گیت کے بول سن کر تو لماں ہتھے سے اکھڑ گئیں۔ لماں نے مرزا صاحب کے گھر جانے کو قدم بڑھائے تو بھابی سامنے آ گئیں۔

''اے لماں بی! سوچو تو ذرا، بدنامی کس کی ہے کتنی مشہور ہو گی یہ بات۔'' بھابی نے سمجھایا تو لماں ٹھنڈی پڑیں مگر نجو کا مار مار کر بھرکس نکال دیا۔

''اور جا حرام خور قطامہ جا اور جا، پوری حرفوں کی بنی ہوئی ہے۔''

''توبہ! ایسی بھی لڑکی کہیں دیکھی نہ سنی، پوری داستان من وعن دہراتی جائے گی، چاہے قیمہ کیوں نہ بن جائے صرف یہ کہہ دیتی کہ لڑکے نے مجھے چھیڑا ہے کمبخت کو بھی مزہ آتا ہے سنانے میں۔'' بھابی نے دونوں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے سوچا۔

''میں تو جس دن سے آئی ان ہی کے جھگڑے نمٹانے میں لگ گئی۔'' اب انھیں

خود پر ترس آیا۔

''اے بی بی! یہی قصہ اپنے ابا اور بھائی میاں کو سنانے نہ بیٹھ جانا، کچھ حیا بھی کر لیا کرو۔'' بھابی کے لہجے میں نہ جاتے ہوئے بھی تلخی آ گئی۔ تب بھابی نے لماں کو سمجھایا کہ حالات کا تقاضا یہی ہے کہ نجم آرا کے ہاتھ پیلے کر دیے جائیں۔

اور پھر لماں کے بھائی اختر کے دوست کے بیٹے کا پیغام آیا اور بھائی میاں نے تمام چھان بین کی لماں اور بھابی نے بالا ہی بالا سب کچھ کر لیا۔ نجم آرا تو اب مکمل طور پر مقید ہو گئی تھیں۔ کڑھائی سلائی کے سنیٹر سے بھی اٹھا لیا گیا۔ تب یہ سب دیکھ کر نجو خوب پھپھک پھپھک کر روئیں۔ لماں سے لڑیں۔ تب لماں نے نفرت سے کہا اور کچھ سنوانا ہو گا ابھی۔'' جب انھیں معلوم ہوا کہ رجب کے چاند ان کی شادی ہے تو سب سے زیادہ خوشی انھیں یہ سوچ کر ہوئی کہ چلو آزادی سے تو گھوم پھر سکوں گی اور پھر یہ گزرتے دن انھیں بڑے طرب انگیز لگے۔ انجو نے کبھی یہ جاننے کی خواہش ہی نہ کی ان کا ہونے والا شوہر کیسا ہے؟ کیا کام کرتا ہے؟ تعلیم کتنی ہے؟ ان کے لیے تو آزادی ہی بہت بڑی نعمت تھی۔

بھابی یوں مسرور تھیں کہ اس روک ٹوک سے تو کان نہیں پکیں گے کہ لماں یوں کہتی ہیں، یہ کہہ رہی تھیں لماں!

اور پھر ایک روز ان کی چھوٹی نند آئی اپنے بھائی کے بارے میں خوب باتیں بتائیں اور سرگوشی میں بولی۔ ''آپ کہیں تو تصویر دکھاؤں؟''

اس نے چھوٹا سا پرس کھولا تصویر دکھائی تو انجو نے آنکھوں پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔

''لماں کہتی ہیں منگیتروں کی تصویریں دیکھنا اور دکھانا بڑی بے حیائی ہے۔''

(جب اپنا ہے ہی تو کیوں نہ مجسم دیکھیں نہ کہ ندیدوں کی طرح تصویریں دیکھیں) اور جب ان کی نند نے ان کی تصویر مانگی تو انھوں نے بتایا کہ ان کی تو تصویریں ہی نہیں اُتریں اسکول کے زمانے میں جو کھینچی تھیں، وہ تمھارے کس کام کی حالانکہ یہ بات سچی تھی مگر اسے جھوٹ سمجھا گیا۔

''ہائے کمبخت! کتنی حسین لگ رہی ہے۔'' ایک لڑکی نے دلہن دیکھ کر کہا تو نجم آرا نے ٹھوکا مار کر راشدہ سے کہا۔

"اماں کہتی ہیں، ہائے کہنے سے نظر لگ جاتی ہے۔ اس لڑکی کو بتاؤ کہ ہائے نہیں کہتے۔"

تب راشدہ نے جھنجلا کر ان کے کان میں کہا۔

"مانا کہ تو حکمت کی پٹاری ہے۔" مگر آج تو زبان بند رکھ۔" (چاہے نظر لگ جائے)

"جو لڑکیاں شادی سے پہلے سنگھار نہیں کرتی ہیں ان پر یونہی پھبن آتی ہے ماشاء اللہ۔"

کوئی بزرگ خاتون بولیں۔

"خوش!" راشدہ نے سرگوشی کی۔

"السلام علیکم!" نوشہ میاں نے ہزاروں تمنائیں "سلام" میں سمو کر کہا۔

"وعلیکم السلام!" ایک نقرئی گونج کمرے کی فضا میں اُبھری تو نوشہ میاں کو شاک سا لگا ان کا خیال تھا، یہ حسین دلہن (بقول بہنوں کے) دایاں ہاتھ پیشانی تک لے جا کر جواب دے گی۔

"ماشاء اللہ کافی مہارت ہے جواباً سلامتی بھیجنے میں۔"

"اماں کہتی ہیں سلام کا جواب ضرور دینا چاہیے۔" (اس بار آواز بہت دھیمی تھی)

دلہن صاحبہ گھونگھٹ کی اوٹ سے بولیں۔ نوشہ میاں کا دل دلہن کی طراری پر مکدر سا ہو گیا۔

گھونگھٹ اٹھایا تو مثل حور، پری تمثال حسینہ سامنے تھی، وہ تو سب کچھ بھول بھال کر وارفتگی سے بولے۔

"ماشاء اللہ!"

اور زندگی میں پہلی مرتبہ شاید نجم آراء کو ڈھیری شرم آئی۔ ایک نظر دیکھنے کی ہزار خواہش اور نوشہ میاں کے آنکھیں کھولنے کے ہزار اصرار کے باوجود بوجھل پلکیں نہ اُٹھ سکیں۔

دوسری صبح وہ جھینپی جھینپی سی مسہری پر سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ عورتوں اور لڑکیوں کا ایک جم غفیر کمرے میں داخل ہوا۔ طرح طرح کے نامعقول مذاق ہوئے۔ کوئی انھیں تھامے ہوئے غسل خانے تک لے گیا۔ کوئی دودھ جلیبیاں کھانے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ نجم آراء کو یہ سب بڑا اچھا معلوم ہوا ورنہ اپنے گھر میں تو صبح ہی صبح اماں کی ڈانٹ کھانی پڑتی تھی۔ سارے گھر کو ناشتا کرا کے خود ناشتا کرتی تھیں۔ "ہائے کتنی قدر ہو رہی ہے۔" وہ تو ابھی تک نوشہ میاں کی باتوں میں سرشار تھیں جو انھوں نے چپکے چپکے ان کے کان میں کہی

تھیں۔ نجم آراء کو یہ گھر جنت معلوم ہوا۔

اور جب ان کی نند نے ان کے بال سنوارتے وقت اپنے بھائی کو مخاطب کر کے ان کے بالوں کی تعریف کی تھی، وہ واقعی شرما گئی تھیں (حفاظت بھی تو کتنی کی ہے میں نے)

اور جب ان کے ہاں نئے مہمان کی آمد ہوئی تو گھبرا سی گئیں۔ اللہ کتنی شرم آئے گی جمال کو بتاتے، بس ان کی بھابی اور اماں کو معلوم تھا۔ جب ساس سے ہوتی ہوئی یہ بات جمال تک پہنچی اس نے شکوہ کیا کہ اس خوشخبری سے اُسے کیوں محروم رکھا گیا۔ اور تب انھوں نے رُخ موڑ کر دھیمے سے بتایا کہ اماں کہتی ہیں اپنے مرد سے بھی شرم کرنی چاہیے۔ لحاظ کرنا چاہیے۔

اس گھر میں واقعی نجم آراء کو بہت سی نعمتیں ملی تھیں۔ ان کے گھر میں دو کمرے اور صحن کچا تھا۔ باورچی خانہ اتنا چھوٹا کہ دو کے بعد تیسرے کی گنجائش نہ نکل سکے۔ ایک بینڈ کا ریڈیو تھوڑا سا فرنیچر اور اماں کی گالیاں تھیں۔ برعکس اس گھر کے یہاں تو چار کمرے، پکا صحن، ٹی وی، وی سی آر، دو صوفے، نواڑ کے پلنگ، دو مسہریاں، صاف ستھرا گھر، آندھی طوفان سے محفوظ۔ وہ واقعی خوش تھیں۔

جمال گھر میں داخل ہوا تو منا بری طرح رو رہا تھا۔ اور نجم آراء ایک طرف بیٹھی بال بنا رہی تھیں۔

"تم سے اٹھایا نہیں جاتا کس بری طرح رو رہا ہے؟" جمال نے خفگی سے کہا تو تڑ سے جواب۔

"ہماری اماں (سسرال میں "ہماری" کا اضافہ ہو گیا تھا) کہتی ہیں گود کی عادت نہیں ڈالنا چاہیے بچوں کو، عادت خراب ہوتی ہے۔ اب ہما اور تاج (نندیں) تو کالج چلی جاتی ہیں، اماں بیمار ہیں، مجھے سینکڑوں کام کرنے ہوتے ہیں، کام کروں کہ ان لاٹ صاحب کو گود میں اٹھاؤں!"

جمال سے کوئی جواب نہ بن پڑا ناچار خود اٹھا لیا۔ مگر کچھ گرم گرم سا محسوس ہوا تو گھبرا کر دیکھا۔ ننھے میاں اپنے والد ماجد کی گود کو بطور بیت الخلاء استعمال کر چکے تھے۔ دور بیٹھی نجم آراء کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی، مگر جمال باقاعدہ خفا ہو گیا۔ اتنے صاف ستھرے کپڑے خراب ہو گئے اور نہانے کی حاجت پیش آ گئی تھی جب کہ اس کا دل اس وقت صرف آرام کرنے کو چاہ رہا تھا۔ نجو نے منے کو گود میں لے لیا اور کپڑے تبدیل کر

کے وہیں لٹا دیا۔ جمال کو کپڑے لا کر دیے اور اس کا خفا خفا سا موڈ دیکھ کر بولیں۔

''اتی اتی سی باتوں پر خفا نہیں ہونا چاہیے۔ ہماری اماں کہتی ہیں، بچے پالنے کے لیے ماں باپ دونوں کو قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔'' جمال اسے دیکھ کر رہ گیا۔

تاج کے کالج میں فنکشن تھا۔ وہ نجم آراء کی سنگھار میز پر بیٹھی روز لگا رہی تھی۔

''اے تاج بیگم! کنواری لڑکیوں کو اتا بننا سنورنا نہیں چاہیے۔ بیاہ پر نور نہیں آتا۔ ہماری اماں کہتی ہیں سارے چاؤ اور ارمان کنوار پن میں ہی نہیں نکال دینے چاہئیں۔ کچھ شادی کے بعد کے لیے بھی رکھ دینے چاہئیں۔''

''اوہ ہو! ان کی اماں ہی جہان بھر سے نرالی ہو گئیں۔ ہمارے بھائی اور اماں تو کچھ نہیں کہتے۔'' تاج جو اتنے انہماک سے بن سنور رہی تھی، بھابی کی ٹوک اسے بہت بری لگی۔

''کبھی کبھار ہی تو کرتے ہیں بھابی!'' تاج نے خود پر قابو پا کر کہا۔

''زہر چٹکی بھر کھاؤ یا مٹھی بھر۔ بات تو ایک ہی ہوتی ہے۔'' نجم آراء نے بڑے تیکھے لہجے میں کہا۔

تاج کو ایک دم تاؤ آ گیا۔ فوراً کمرے سے چلی گئی۔

رات کو جمال نے کہا۔ ''نجم آراء! کرنے دیا کرو سنگھار ہما اور تاج وغیرہ کو ہم بے جا روک ٹوک کریں گے تو ہمارے متعلق کیا احساسات لے کر یہ اپنے سسرال جائیں گی۔ آئندہ نہ کہنا۔''

تب نجم آراء بھڑک اٹھیں۔

''لو اپنا سمجھ کر کہہ دیا، کون سا گلیوں میں جاتی ہوں سمجھانے، کسی کی لڑکیوں کو۔ اپنوں کو ہی کہا جاتا ہے۔ میری تو کوئی قدر ہی نہیں۔ ہماری اماں کہتی ہیں بڑی بھابی ماں کی جگہ ہوتی ہے۔ توبہ توبہ بابا! اتی چالاک لڑکیاں، بھائی سے شکایتیں کرتی ہیں۔ اے ہاں مجھے ہی کہہ دیتیں کہ بھابی مجھے آپ کی بات بری لگی تو کون سا میں کچا چبا جاتی۔ ہماری بھابی تو اتا اتا کہتی تھیں۔ کبھی بھول کر بھی ماں یا بھائی سے نہ کہا۔ توبہ توبہ۔''

یہ کہتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ جمال بھی پیچھے نکل گیا۔ وہ سمجھا شاید وہ تاج سے لڑنے جا رہی ہے مگر وہ تو سیدھی باورچی خانے میں گھس گئی تھی۔ تب جمال بھی شرمندہ سا ہو گیا۔ ٹھیک تو کہہ رہی ہے نجم آراء۔ تاج کو برداشت کرنا چاہیے۔

پھر ایسا ہوا کہ ہما اور تاج کچھ بھی کہتی رہتیں وہ بالکل نوٹس نہ لیتا۔

''اماں! بچے کی مالش ایسے نہیں کرتے۔ تم نے تو منے کا پیٹ ہی دبا دیا۔ ہماری اماں کہتی ہیں.....''

''اے بس بی بی! ہم نے بچے پالے ہی نہیں، بس تمہاری اماں نے ہی پالے ہیں۔ اے ہاں جب دیکھو ہماری اماں یوں کہتی ہیں۔ ہماری اماں یوں کہتی ہیں۔ اے ہاں! ان کی اماں کا کہا نہ ہوا کسی ولی کا نعوذ باللہ قول ہو گیا۔''

''ایسے نہ کہو ہماری اماں کو۔'' انھوں نے تنگ کر کہا۔

''اے ہاں بھابی! تم ہماری چوٹی کو پہنچ جاؤ اور ہم تمہاری اماں کو کچھ نہ بولیں۔ جن کے اقوالِ زریں چلتے پھرتے چوبیس گھنٹے سنائی دیتے ہیں۔ تاج نے بات کاٹ کر کہا تو اماں نے تاج کو ڈانٹ دیا۔

''خبردار! تو چپ رہ، بڑی بھابی ہے۔''

''اے ہاں دلہن، تمہاری اماں نے جو باتیں کہی ہیں تمہارے لیے کہی ہیں ہمارے لیے نہیں۔ آئندہ ذرا دھیان رکھنا۔''

جمال نے یہ سب کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھی اور تاج کے اقوالِ زریں کہنے پر اس کو ہنسی بھی آئی تھی۔ نجم آراء ایک دم سے اندر آئیں اور دھپ سے پلنگ پر گر کر رونے لگیں۔ جمال بری طرح گھبرا گیا۔

''کیا ہوا انجو رانی!'' مگر اس کا ہاتھ بڑی بے دردی سے جھٹک دیا گیا۔

''کیا ہوا بھئی، بولو تو سہی۔''

''آپ کی اماں اور بہن نے اتی بے عزتی کی ہماری اماں کی۔ ہاں لو بھلا جب ہماری ماں کی کوئی عزت نہیں تو ہماری خاک ہو گی۔'' روتے روتے کہا گیا۔

''کوئی بے عزتی نہیں کی۔ اماں تو یوں ناراض ہو گئیں کہ تم نے ان کی کاٹ کر دی تھی۔ بزرگ تو ایسی باتوں کا برا مانتے ہی ہیں..... دیکھو وہ تو تمہیں اپنی بیٹی کی طرح سمجھتی ہیں..... ٹھیک ہے، اگر تاج کی بات کا برا مانا ہے تو میں ڈانٹوں گا اسے.....''

''میں تو خود ہی اسے ڈانٹ دیتی، ایسی باتیں سناتی کہ..... نہ بھولتی مگر ہماری اماں.....''

''ہاں ہاں! کیا کہتی ہیں تمہاری اماں.....؟'' جمال نے شرارت سے اس کے یوں رک جانے پر استفسار کیا تو اس نے منہ پھیر لیا۔

''بتاؤ بھئی، کیا کہتی ہیں تمہاری اماں؟'' وہ اس کا رخ اپنی طرف کرتا ہوا بولا۔

تب نجم آراء نے بڑے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''آپ کی کچھ نہیں لگتیں؟''

''اچھا بھئی، ہماری بھی اماں۔ کیا کہتی ہیں وہ؟'' وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

''کچھ نہیں۔'' نجم آرا کے چہرے پر دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔

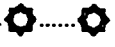

ایک گلاب

حالانکہ آج تو میں معمول سے لیٹ ہو گیا تھا۔ سگنل پھر بھی سرخ ہی ملا تھا۔ جیسے یہ میرے نصیب کا حصہ ہو۔ جسے ضرور ہونا ہو۔

میں نے بیک ویو مرر میں نظر ڈالی تو پیچھے گاڑیوں کا ہنگام محشر برپا تھا اور اسی طرح میرے آگے بھی کافی گاڑیاں تھیں۔

سخت کوفت ہوتی ہے۔ گاڑی کی رفتار نہیں ٹھہرتی، گویا ایک تخیلاتی دنیا درہم برہم ہو جاتی ہے۔

جیسے کہ اسٹیئرنگ سنبھالتے ہی میں..... آنے والے چند گھنٹوں کو بک کر چکا تھا۔ گھر تک کے سفر کا دورانیہ غسل، چائے، ہمدانی صاحب کی فائل۔

آئی جی صاحب کے پی۔ اے کو بہت ضروری فون، پھر رات نو بجے ظفر کے ہاں کھانے پر مجھے ایک دم احساس ہوا۔

ان تمام کاموں کے دوران وہ کہیں ''فٹ'' نہیں تھی۔ کیا وہ ظفر کے ہاں میرے ساتھ کھانے پر بھی نہیں جا سکتی؟

''صاحب جی! تازہ موتیے کے گجرے ہیں۔ لے لیں۔''

''میرے برابر والی سیٹ خالی تھی، پھر یہ گجرے بیچنے میرے پاس کیوں چلا آیا۔''

''میں گجرے نہیں پہنتا۔'' میرے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ اس لیے خشک انداز میں جواب دے کر سگنل دیکھنے لگا۔

''صاحب جی! بیگم صاحبہ کے لیے لے جائیں۔ شام کا ٹیم ہے۔ خوش ہو جائیں گی۔''

میں نے ابھی ایک نگاہِ غلط بھی اس آواز کی طرف نہیں ڈالی تھی۔ انتہائی تعجب سے دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ بمشکل دس گیارہ سال کا بچہ تھا۔

انتہائی گھسے ہوئے مگر صاف ستھرے کپڑے پہنے تھا۔ بال بھورے تھے یا شاید دھوپ نے ان کی سیاہی چھین لی تھی۔ بڑی بڑی نیلی آنکھیں۔

آنکھیں...... عجیب سی یاسیت جن کی بنیاد تھی۔

کہانیاں سی سُناتی ہوئی آنکھیں......

اسی دم سگنل زرد ہو کر سبز ہو گیا۔ گاڑیوں کا ٹھہرا ہوا سمندر گویا اُبلنے لگا۔ میں نے بھی گاڑی فوراً آگے بڑھا دی تھی۔

اس کی آنکھیں بہت غیر معمولی تھیں۔

یا شاید تاثرات غیر معمول تھے۔

چوبیس گھنٹوں میں سینکڑوں لوگ ملتے ہیں۔ مگر حافظے کی اسکرین پر نقوش یوں ثبت نہیں ہوتے جیسے مجھے اس کی آنکھیں ''زبانی'' یاد ہو گئی تھیں۔

''بیگم صاحبہ کے لیے لے لیں۔'' اس کی مہین دودھ سے مہکتی آواز مجھے پھر یاد آئی۔

''ہونہہ! بیگم صاحبہ!'' میرے وجود میں جیسے انگارے سُلگ اٹھے تھے۔

گاڑی پورچ میں پہنچی اور اوپر ٹیرس پر میں نے آنچل کی سرسراہٹ محسوس کر لی۔ ایک عجیب سے احساس کے تحت میرے قدم مزید سست ہو گئے۔

اپنے بیڈ روم میں داخل ہو کر میں نے ماحول کی سرد مہری محسوس کی اور اپنے معمولات میں مصروف ہو گیا۔

نہا کر باہر آیا تو کمرے میں چوڑیاں ساز چھیڑ رہی تھیں۔ میں نے انتہائی کوشش کے بعد خود کو اس کی طرف دیکھنے کے لیے تیار کیا۔

''چائے یا کھانا؟'' دھانی سوٹ میں ملبوس وہ پہلو بچاتی ہوئی اپنے نمکین چہرے کے ہمراہ پھر میرا دکھ بڑھانے لگی۔

''چائے...... کھانا آج ظفر کے ہاں ہے۔'' میں نے رسانیت سے جواب دیا۔

''اگر دل چاہے تو تم بھی چلو۔'' میں نے پھر اس کا چہرہ ٹٹولا۔

اس نے مجھے دیکھتا پا کر پھر اپنی پلکوں کی جھالر گرا لی تھی۔

''میں کیا کروں گی جا کر...... آپ تو......''

''کیا آپ تو......؟'' میں نے سوال کیا۔

''کچھ نہیں۔ میں چائے بھجوا دیتی ہوں۔'' وہ تیزی سے پھر باہر نکل گئی تھی۔

''ایک تو ظالم کا چہرہ بھی ایسا ہے کہ خود بخود میرا لہجہ نرم ترین ہو جاتا ہے۔ ورنہ بعض اوقات جی تو یہی چاہتا ہے کہ بے نقط سُنا کر دل کا سارا غبار نکال ڈالوں۔''

وہ چائے لے کر آئی تو میں۔ آئی جی صاحب کے پی اے کو فون کرنے میں مصروف تھا۔ اور بیڈ پر بے تکلفی سے دراز تھا۔ اس نے چائے کا سامان تپائی پر رکھ کر ایک موڑھا گھسیٹ کر تپائی کے قریب کیا اور بیٹھ گئی۔ یہ اس کا انداز تھا۔

حالانکہ بیڈ پر اتنی جگہ خالی تھی۔ مگر غیریت کا تاثر جو اس نے بہر طور دینا تھا۔ میرا جی مکدر رہا۔ اسے کس چیز کی کمی ہے۔

مجھے یہاں کس چیز کی کمی تھی جو میں سرحد پار سے بیاہ کر لایا؟ اگر دیکھا جائے تو اُسے خوشی سے مگن رہنا چاہیے۔ نقوش و رنگت سے تو میں اہل یورپ سے ہی متعلق...... نظر آتا ہوں پھر معاشی لحاظ سے بھی اللہ کا بے حد احسان ہے۔

''رات بارہ بجے تک واپسی ہوگی۔ ڈرو گی تو نہیں؟'' میں نے ریسیور رکھ کر اس سے یونہی پوچھ لیا۔

''اب تو عادت ہو چکی ہے۔'' وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

''دل چاہتا ہے، کبھی تمہاری پٹائی کر ڈالوں؟ یہ اس کی معصومیت پر میرے پیار کا بے اختیار اظہار تھا۔ اس نے شکر ملاتے ملاتے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ مگر کوئی تاثر نہیں دیا۔

''ایسے کون سا میں روز راتوں کو دیر سے آتا ہوں؟ آپ کو عادت ہو چکی ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''اکثر تو ایسا ہوتا ہی ہے مگر میں اعتراض تو نہیں کر رہی ویسے ہی کہہ رہی تھی۔''

''اپنی ساس نندوں سے فون پر باتیں کر لیا کرو۔ اگر بوریت ہو۔ اور یوں بھی میری موجودگی سے تو تم بور ہی ہوتی ہو۔ پابند سی ہو جاتی ہو۔ میرا گھر سے باہر رہنا تو تمہارے حق میں بہتر ہی ہے۔''

وہ کپ میرے سامنے رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے پھر کچھ نہیں کہا۔

...... ✿ ......

جب پہلی مرتبہ میں امی کے ہمراہ ہندوستان کے شہر لکھنؤ گیا تو اس وقت فرسٹ

ایر کا طالب علم تھا۔ امی کے رشتے دار تو زیادہ تر لکھنؤ اور بمبئی میں تھے جبکہ والد صاحب صوبۂ سرحد کے باسی تھے۔ یعنی ہمارے آباؤ اجداد روسی تُرکستان سے ہوتے ہوتے آخر کار سرحد میں مقیم ہو گئے تھے۔ میرے نانا اور دادا انگریز راج کے زمانے میں دوست بنے تھے۔ (اپنی ملازمتوں کے سبب) اور اس دوستی کو مضبوط بنانے کے لیے گویا یہ رشتہ ہوا تھا۔

مجھے خود بھی ہندوستان دیکھنے کا خاصا شوق تھا۔ لہٰذا جب امی اپنے میکے جانے لگیں تو میں بصد شوق ان کے ہمراہ ہوا۔

میرے ننھیال والے بہت وضع دار و رکھ رکھاؤ والے تھے۔ اتنے خوبصورت ماحول میں میرا خوب دل لگا تھا۔

انہی دنوں یہ ''محترمہ'' غالباً ابتدائی پرائمری کلاسز میں ہوا کرتی تھیں۔ اپنی امی کے ہمراہ رام پور شہر کے کسی نواحی علاقے سے تشریف فرما ہوئیں۔ یہ میری سب سے چھوٹی خالہ کی نند تھیں۔ انتہائی سہمی سہمی اور خوف زدۂ اعتماد سے قطعاً عاری۔

گھر بھر کے اور محلے کے بچے شام کو بڑے سے دالان میں ہلڑ بازی مچایا کرتے تو یہ جائے پناہ ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔

سب بچے انھیں بہت ستاتے تھے غالباً بچے کسی بچے کو خود سے دبتا دیکھ کر جذبہ حاکمیت کی تسکین محسوس کرتے ہیں۔ ایسے میں اگر میں داخل ہو جاتا تو فوراً دادرسی ہو جاتی تھی۔ بعض اوقات تو بچوں کی دھکم پیل میں وہ کچے فرش پر گھٹنوں کے بل گری ملتی تھیں۔ چڑیا جیسی معصوم اور دلکش، مجھے اس ظلم پر بعض اوقات اتنا غصہ آ جاتا تھا کہ لگے ہاتھوں موقع، واردات پر دو چار کے جڑ بھی دیتا تھا۔ یوں بھی بچوں میں، میں بڑا بچہ تھا۔ بچے مجھ سے ڈرتے تھے۔ ان کو بازو سے پکڑ کر اٹھاتا۔ کہنیوں اور گھٹنوں سے خاک جھاڑتا۔ رخساروں پر بہنے والے اشک صاف کرتا۔ میرا ان کے ساتھ وہی رویہ ہوتا جو کسی بڑے کا بچے کے ساتھ ان حالات میں ہو سکتا تھا۔

ان کی انگلی تھام کر چھوٹی خالہ جان کے پاس لا کر ان کی کوتاہی انھیں محسوس کرانے کی کوشش کرتا تو بے زاری سے جواب ملتا۔

''تو جاتی کیوں ہیں۔ جائے بنا کھانا بھی ہضم نہیں ہوتا۔ انہی کے پہرے کو رہ گئی ہوں۔ میں تو لا بھی نہیں رہی تھی۔'' ''یہ'' کہنے لگے چھٹیاں ہیں لے جاؤ۔ اسکا بھی دل بہل

جائے گا۔''

''ایسے شریر بچوں کے بیچ پڑتی کیوں ہو؟''

اب وہ براہ راست پھٹکارتیں اور چھلے ہوئے گھٹنوں پر اینٹی بائیوٹک قسم کا کوئی پاؤڈر بھی چھڑکنے لگتیں۔ ان کا انداز اپنائیت بھرا نہیں۔ بلکہ رسمی ہوتا تھا۔

یہ تو تھے وہ واقعات جو خاصے عرصے پہلے کے تھے۔ دوبارہ جب ہندوستان گیا خاصا کامیاب قانون دان بن چکا تھا۔ پی ایچ ڈی کرنا میرا شوق ٹھہرا تھا۔ لہٰذا تحقیق بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

بڑی بہن اور دونوں چھوٹی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ حتیٰ کہ مجھ سے چھوٹے خاور کی بھی اسی کی پسند سے اسی کی کلاس فیلو سے، وہ بی۔ ای انجینئر تھا۔ میری مصروفیات اس قسم کی تھیں اور پھر پتا نہیں کیوں میرا موڈ بھی نہیں بنا تھا کہ شادی کے سلسلے کی طرف متوجہ ہوتا۔

کبھی کبھی مجھے لکھنؤ میں گزارے ہوئے دن یاد آتے تھے۔ تو ایک ہیولا بھی ذہن میں سرسراتا تھا۔ ظلم ہر صورت۔ میرے لیے نا قابل برداشت تھا۔ یہ میری سرشت تھی۔ شاید اسی لیے میں نے قانون کا انتخاب کیا تھا۔

وہ بچی بڑی ''یادگار قسم'' مظلوم تھی۔ پتا نہیں بڑی ہو کر کیا ہوئی ہوگی۔ چھوٹی خالہ کا رویہ مجھے پسند نہیں آیا تھا۔ ظاہر ہے میں ٹین ایجر میں شامل تھا۔ اس وقت کوئی دودھ پیتا بچہ تو نہیں تھا۔

میں نے انتہائی ہمدردانہ انداز میں امی کو مشورہ دیا تھا کہ مینا کو اپنے ساتھ پاکستان لے چلیں۔ وہاں ہم اس کو بہت اچھے سے اسکول میں داخل کرائیں گے۔ اسے لیڈی ڈاکٹر بنائیں گے۔

''لو بھلا پرائی بچی اس طرح بھی لے جا سکتے ہیں۔ اللہ رکھے اس کے باپ کو، بھائیوں کو، بچوں کو جو آرام اپنے گھر میں مل سکتا ہے وہ کہیں اور نہیں۔''

شاید میں بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ جو امی نے اس قدر..... تفصیل سے مجھے سمجھایا تھا۔ اب جب میں لکھنؤ گیا تو یقین کریں میرے ذہن میں مینا کے بارے میں کوئی تصور نہیں تھا۔

وہ تو میرے ماموں جان رام پور جا رہے تھے۔ مجھے بھی دعوت دی کہ ایک دو روز وہاں کی سیر بھی سہی۔

اس بار سب سے پہلے مینا سے سامنا ہوا۔ میں اور ماموں جان جیسے ہی ٹیکسی سے اترے وہیں دروازے میں کھڑی سبزی خرید رہی تھی۔ سولہ سترہ سال کی ایک سادہ سی لڑکی۔

"آداب! بھائی صاحب!" اس نے ماموں جان کو فوراً آداب کیا اور میری سمت متوجہ ہو کر خاموش سی ہوگئی۔

"ارے بھئی، یہ تمھارے خاص مہمان ہیں۔ پاکستان سے آئے ہیں۔ یاور علی خان صاحب۔" ماموں جان نے اظہار اپنائیت کے طور پر میری پیٹھ تھپتھپائی تھی۔

مینا نے خاصے بے نیاز انداز میں مجھے آداب کیا اور ہمیں لے کر چلی آئی۔ وہ ننھی منی، دبلی پتلی مینا؟ میرے ذہن میں سوال جاگے۔

"کس قدر جاذب اور دلکش نکلی ہے۔" یہی سوچ میرے ذہن میں آئی تھی۔

دراصل پُرکشش اور دلکش لگنا اتنا فطری ہے کہ اس کی تشریح نہیں ہوسکتی۔ بعض چہرے بہت مناسب نقوش کے حامل ہوتے ہیں۔ مگر ایک سے دوسری بار دیکھنے کو دل نہیں چاہتا مگر بعض لوگ بظاہر بڑے عام سے نظر آتے ہیں مگر ان میں غضب کی مقناطیسیت ہوتی ہے۔ دل کھنچا چلا جاتا ہے۔ مجھے مینا انہی میں سے ایک دکھائی دی تھی۔ ہماری عمروں میں اچھا خاصا تفاوت تھا۔

مگر جذبے عمر و زمان اور مکان کی قیود سے بالاتر ہوتے ہیں۔

اور اچھا لگنا ہی محبت کی ضمانت نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود......

بس مجھے وہ اچھی لگی تھی شاید اس لیے کہ وہ بہت فطری تھی۔ ایک ایک ادا۔ بول چال، لب ولہجہ، چال ڈھال اور روبرو طرز عمل ہر بات فطری تھی۔

موصوفہ تھیں ابھی تک خاصی سہمی ہوئی شخصیت۔ میری خالہ یعنی اپنی بھابی سے بات کرتے ہوئے وہ بہت بدحواس نظر آتی تھیں۔

"آپ کے نام کے اسپیل (ہجے) کیا ہیں؟" مجھ جیسے خاصے سرد طبع آدمی کو بھی ان کی سادہ لوحی نے شرارت پر مجبور کر دیا تھا۔

کھڑی مٹکے میں پانی انڈیل رہی تھیں۔ آہستگی سے بولیں۔ "ایم ڈبل ای این اے۔"

"آپ کو الہام ہوگیا تھا کہ انگریزی کے ہجے پوچھ رہا ہوں؟" مجھے تعجب ہوا۔

"آپ نے اسپیل کہا تھا۔" وہ پیتل کی بالٹی سمیت آنکھ سے اوجھل ہوگئی تھیں۔

"لڑکی کم گو ضرور ہے، بے وقوف نہیں۔" میں مسکرا دیا تھا۔ اب ظاہر ہے میری اور مینا کی عمر میں اتنا فرق بھی نہیں تھا کہ خوشگوار جذبہ پیدا نہ ہوسکتا۔ بس وہ مجھے اچھی لگی تھی۔

کیوں؟

اس کیوں پر تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔

اگلے روز مینا کہیں جانے کے لیے خالہ جان سے اجازت مانگ رہی تھی کہ میں سر پر پہنچ گیا۔

"بی بی! گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ بارات پرسوں آئے گی۔ مہندی میں جانا کوئی اتنا بھی ضروری نہیں۔"

"ٹھیک ہے بھابی جان!" وہ پلٹی تو مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"مہمانوں کے کون سا کام آ رہی ہیں۔ جانے دیجیے۔ ویسے مینا آپ نے مجھ سے یہ تو پوچھا نہیں کہ میں آپ کے نام کے اسپیل کیوں پوچھ رہا تھا؟"

"مرضی ہے آپ کی۔" بے انتہا سرد و زرد پڑتی دکھائی دی۔ جان چھڑاتے ہوئے بولی تھی۔

"مگر سوال تو پیدا ہونا چاہیے۔ آخر آپ باشعور خاتون ہیں۔"

"میرے ذہن میں سوال پیدا نہیں ہوتے۔" وہ ناراضگی سے گویا ہوئی تھی۔

"خاصا عجیب وغریب ذہن ہے۔" وہ مجھ سے نظریں چراتی تو اتنی دلکش ہو جاتی کہ ہر مثال کم محسوس ہوتی۔

بھئی، میں اس لیے پوچھ رہا تھا۔ آپ اڑانے والی مینا سے ہوتے ہوتے مینا بنی ہیں یا ہیں ہی مینا؟" میں شریر ہوا۔

خالہ جان گھر کی پڑھی ہوئی خاصی عام سی خاتون ہیں۔ وہ اس ذومعنی جملے کو سمجھنے سے قاصر رہیں۔

اور مینا جلدی سے باہر چلی گئی تھی۔

"ارے اس لڑکی کے تو چہرے ہی سے مسکینی ٹپکتی ہے۔ رُوتے کیوں ہو؟ کہا

صورت ہی ایسی ہے۔ یہ مشل ہے یہاں تو۔

وہ ہماری دیورانی کہتی ہیں مینا میرے پاس رہو۔ بہت آرام ملے گا۔ جیسے میں اس سے کنویں کھدواتی ہوں کریں دھریں گی خاک بھی نہیں۔ یہ مجھے پتا ہے۔

جیٹھ خاندان سے کٹے ایک طرف بیٹھے ہیں۔ ان کی ناک ہی دس بالشت کی ہے۔ چالاک ہیں سب۔ لڑکی ہمارے سر ڈال دی۔

میاں، میرے سسر کل دس ہزار روپے مینا کے نام کر کے مرے تھے، اللہ بخشے، تم ہی کہو۔ دس ہزار میں شادیاں ہوئی ہیں؟''

اوہ۔

اب مجھے خالہ جان کے اس کے ساتھ حسن سلوک کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔ میں بہت خوبصورت ارادے کے ساتھ اس مرتبہ پاکستان لوٹا تھا اور سوچ لیا تھا۔ اس مرتبہ امی کے پوچھنے پر مینا کا نام بتا دوں گا۔

.....

ایک مرتبہ امی بڑے اہتمام سے میری شادی کے موضوع پر گفتگو کرنے آئیں۔ (میرے کمرے میں) تب میں نے انھیں بتا دیا کہ میں سرحد پار شادی کرنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔

امی کے استفسار پر مینا کا نام بتا دیا۔

امی ہکا بکا میری شکل دیکھنے لگی تھیں۔

''اتنی دور شادی تو خاصا مسئلہ ہے بیٹے اور پھر مینا؟ اس کی اور تمہاری عمر میں بھی خاصا فرق ہے۔'' وہ شاید وہاں میری شادی پر آمادہ نہیں تھیں۔ اپنے طور پر انھوں نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔

''میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ خالہ جان کو لکھ دیں۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیں کہ ہمیں جہیز وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ایک پیسے کی چیز ہمیں منظور نہیں۔''

امی الجھن میں پڑ گئی تھیں۔

سوچوں گی۔ وہ یہ کہہ کر اٹھ گئی تھیں۔

مگر مجھے خود پر اعتماد تھا اور یہ یقین تھا کہ حالات میرے حق میں ہو جائیں گے۔

امی نے بہنوں کو بھی بتا دیا تھا۔

وہ سب مجھے سمجھا رہی تھیں کہ یہاں ایک سے ایک لڑکی موجود ہے۔ ہم نے تو اس لڑکی کو دیکھا تک نہیں ہے۔ وہ ہمارے گھر میں ایڈجسٹ بھی ہو سکے گی یا نہیں؟

''میں اسے دیکھ چکا ہوں، یہ بہت ہے۔ ایڈجسٹ اسے میرے ساتھ ہونا ہے۔ ہو جائے گی۔''

بالآخر بابا جان سے مشورہ کر کے امی نے خالہ جان کو خط لکھ دیا۔ جواب میں خالو جان کا خط آیا تھا۔ انھوں نے اس رشتے پر بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ میری خوشی کی کوئی انتہا ہی نہیں تھی۔ چشم تصور میں مینا کو اس گھر میں چلتے پھرتے دیکھ رہا تھا۔

مگر یہ خوشی اس وقت ختم ہو گئی جب خالہ جان کا دوسرا خط آیا کہ مینا کو اس کے بڑے بھائی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ اور وہ ہندوستان سے باہر شادی کرنے پر رضامند نہیں ہیں۔ اب تو میری حالت غیر ہو گئی۔

امی سے کہا وہ فوراً سے پیشتر میرے ساتھ ہندوستان چلیں۔ مینا کے بڑے بھائی جان سے ہم خود ملاقات کریں گے۔

ہندوستان پہنچ کر ہمیں بہت پاپڑ بیلنا پڑے۔ خالو کے بڑے بھائی تک رسائی ہی نہیں ہو رہی تھی۔

وہ بمبئی میں تھے۔ ہمارے پاس وہاں کا ویزا نہیں تھا۔ بڑی تگ و دو کے بعد انھیں بلوایا گیا۔ انھوں نے باقاعدہ میرا انٹرویو لیا۔ ساتھ میں امی کا بھی۔ جب ان کی بیوی نے سنا ہم جہیز وغیرہ کے قائل نہیں ہیں۔ تو انھوں نے شوہر پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔

اتنے جتن کے بعد وہ دن آیا کہ مینا رام پور لائی گئیں اور خاموشی سے نکاح ہو گیا۔

میں کس قدر خوش خوش پاکستان مینا کو لے کر آیا تھا۔

مگر عجب تماشہ ہوا۔

میں تو سوچ رہا تھا کہ خالہ جان وغیرہ نے مینا کو میری ''جدوجہد'' کے بارے میں بتایا ہوگا۔ وہ میری محبت اور توجہ پر نہال ہو گی۔

مگر وہ تو کوئی پتھر کا بُت تھا۔ لڑکی نہیں تھی۔

اس کا رویہ اتنا سرد اور انداز لیا دیا تھا کہ میں عام حالات میں اس کے شانے پر

ہاتھ رکھتے جھجکتا تھا۔

اگر کبھی اظہار اپنائیت کے طور پر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیتا تو وہ بیزاری سے فوراً میرا ہاتھ جھٹک دیتی۔

ایک بار

دو بار

آخر کتنی بار۔ میں مرد بچہ ہوں۔ عورت کا یہ انداز سخت توہین آمیز ہوتا ہے۔ میں عالم پریشانی میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ میری ایک طرفہ کارروائی کے سبب مجھ سے زیادتی تو نہیں ہو گئی؟

شاید وہ مجھ سے شادی پر آمادہ نہ ہو۔ کسی طور اس کی رائے بھی تو معلوم کرنا چاہیے تھی۔

اب مجھے سخت پچھتاوے لاحق ہو چکے تھے۔

ایک احساسِ جرم میرے قلب نے آسیب کی طرح چمٹا لیا تھا۔

ایک روز ہمارے ہاں کوئی تقریب تھی۔ پرپل بھاری ساڑھی میں مینا سب کی نگاہ کا مرکز تھی۔ میں بھی بے اختیار سا ہو گیا تھا۔

مگر اس کے گذشتہ رویے کے سبب بجھ کر رہ گیا تھا۔

''مینا! کیا تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو؟'' بالآخر میں نے قطعی انداز میں سوال کیا۔

اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''اب اس قسم کے سوالات کا فائدہ؟'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں الٹا سوال جڑ دیا۔

اب تو شبہ یقین میں بدل گیا کہ واقعی اس کے ساتھ زیادتی ہو گئی ہے۔

اس سے قبل کہ میں کچھ اور بات کرتا۔ وہ کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔

امی سے بھی کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ یہ شادی میری ضد کے سبب ہوئی تھی۔ وہ تو الٹا مجھے ہی کچھ سنانے لگتیں۔

ہر شے سے میرا دل اُچاٹ رہنے لگا تھا۔

''صاحب جی! تازہ موتیے کے ہیں۔''

گاڑی کے رکتے ہی وہ پھر کہیں سے آدارد ہوا۔ میں جھلا کر کچھ کہنا ہی چاہتا تھا۔ مگر اس کی سمت دیکھ کر جذبات کی کیفیت بدل گئی۔

''کتنے کے ہیں؟''

''تین تین روپے کے۔'' اس کی آنکھوں میں زندگی دوڑنے لگی تھی۔

میں نے اس سے دو گجرے لے کر ڈیش بورڈ پر اُچھال دیے۔

''تم اتنے چھوٹے سے ہو۔ تمھارے گھر میں اور کوئی نہیں ہے کمانے والا؟'' اتنے معصوم سے وجود کو معاش کی چکی میں پستے دیکھ کر میں نے بہت دکھ سے سوال کیا تھا۔

''صاحب! میں اپنے گھر میں بڑا ہوں۔ آپ لوگ گجرے لے لیتے ہیں تو ہمارے گھر میں دو وقت کی روٹی پک جاتی ہے۔ بعض اوقات بکری نہیں ہوتی تو ہمیں نقصان ہو۔''

سبز بتی روشن ہو گئی تھی۔ میں نے اسے پیسے تھما کر گاڑی جلدی سے آگے بڑھا دی تھی۔ ساتھ والے ہمسایے جمیل صاحب کا بیٹا اسی کی عمر کا تو ہو گا۔ سارا دن اپنی چھوٹی سی بائیسکل دوڑاتا رہتا ہے۔ اور اس معصوم پر ذمہ داریاں پہاڑ کی طرح مسلط ہیں۔ مجھے افسوس ہوا تھا۔

''آپ لوگ گجرے لے لیتے ہیں تو ہمارے گھر دو وقت کی روٹی پک جاتی ہے۔''

میرے وجود میں نیلی آنکھوں کے نشتر اترنے لگے۔ میرے حساس دل پر اس کا دکھ دیر تک اُترتا رہا۔

گھر پہنچ کر میں نے کچھ سوچ کر گجرے اٹھا لیے۔

مینا کمرے میں آئی تو خوشبوؤں سے چونک سی گئی۔

تیزی سے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھی۔

''آپ لائے ہیں؟'' اس کی آواز حیرت سے پُر تھی۔

''کیا تمھیں اچھے نہیں لگتے؟'' میں نے شکستہ آواز میں اس سے دریافت کیا۔

''پھول کسے ناپسند ہو سکتے ہیں؟'' وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

''پہن لو۔'' میں نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔

''ادھر آؤ۔'' اسے خاموش دیکھ کر میں نے پھر اپنی انا کو کچلا۔ وہ..... قریب آ گئی۔

''میں نے اس کے ہاتھ سے گجرے لے کر اس کی کلائیوں میں سجا دیے۔ میں نے محسوس کیا۔ جیسے مینا کی آنکھیں بھیگ رہی ہوں۔

''شکریہ!'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''محبت کے عمل میں شکریے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ آئندہ یہ مس فٹ چیز کبھی استعمال نہ کرنا۔''

''محبت؟'' اس نے نظریں اٹھائیں۔ ان میں ازحد استعجاب تھا۔

''تم میرے ساتھ ہو۔ میری ہو۔ پھر کیا ہے یہ.....؟'' میں نے دکھ سے کہا۔

میں نے اس کی کلائیاں چھوڑ دیں۔ اور کوٹ اتارنے لگا۔ وہ باہر نکل گئی تھی۔

پھر یہ میرا معمول ہو گیا۔

میں اس بچے سے روزانہ کئی گجرے لینے لگا۔ اس کے چہرے پر پھیلتی روشنی میری خاموش عبادت کا نور دکھائی دیتی۔ جس سے مجھے عجیب سا سرور محسوس ہوتا۔

اب مجھے مینا کمرے میں منتظر ملتی تھی۔

میرا چہرہ دیکھنے کے بجائے وہ میرے ہاتھوں کی سمت دیکھتی تھی۔ جن میں سفید موتیا اور سرخ گلاب ہوتے تھے۔

اس کے لبوں پر مدھم سی مسکان ہوتی تھی۔ میرے وجود پر سات رنگ اترنے لگے تھے۔ میں انتہائی چاہ سے اس کی کلائیوں میں گجرے پہناتا تھا۔ اب تو بصد تشکر وہ میری کلائیاں تھام لیتی تھی۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو۔

اس کی طرف سے بے تکلفی کا یہ عمل مجھے نئی زندگی دینے لگتا تھا۔ مگر میں نے اس سے کبھی کچھ پوچھا نہیں۔

میں چاہتا تھا، وہ خود ہی مجھ سے بات کرے جو کچھ کہنا چاہتی ہے، خود ہی کہے۔

جب میں اپنا استحقاق استعمال کر کے اس کے ساتھ کوئی لطیف سی شرارت کرتا تو وہ گریز اور بیزاری کے بجائے میرے ہی وجود میں پناہ ڈھونڈتی تھی۔ ان گجروں نے خوشیوں کے ہزار در کھول ڈالے تھے۔

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ صرف پھولوں کے گجرے۔ میری زندگی میں انقلاب لے آئیں گے۔ تو میں سارے شہر کے پھول گھر میں لے آتا۔

اب مجھے دُور ہی سے اس بچے کی تلاش ہوتی تھی۔ خواہ سگنل سرخ ہو یا سبز میں چورنگی پر گاڑی ضرور روکتا تھا۔

''بیٹے تمہاری دعا میں بڑی تاثیر ہے۔ میرے لیے دعا کرو۔ میری خوشیوں کو کسی کی نظر نہ لگے۔''

ایک روز میں نے اس کے رخسار تھپتھپا کر کہا تھا اور وہ بھولپن سے مسکرا دیا تھا۔

''صاحب! بیگم صاحبہ کو گجرے بہت اچھے لگتے ہیں؟ آپ اتنے سارے جو لے جاتے ہیں۔''

میری گفتگو سے بچے کو جرأت ہوئی تھی کہ مجھ سے سوال کر بیٹھا تھا۔

''ہاں، بہت پسند ہیں۔ شاید مجھ سے بھی زیادہ۔'' میں کہہ بیٹھا۔

''اچھا تم بتاؤ۔ تمھیں کیسے پتا چلا کہ میری بیگم صاحبہ بھی ہیں؟'' میں نے اس کی پیاری صورت کو محبت و شفقت کے ساتھ دیکھا۔

''آپ جتنے لوگوں کی بیگم صاحبہ تو ہوتی ہی ہے۔'' (اس مراد عمر سے تھی) اس نے اپنی دانست میں بڑا مکمل جواب دیا تھا۔

یہ میری اس سے آخری ملاقات تھی۔

جی ہاں آخری.....

اس دن جب اس سے بات کر کے گھر پہنچا تو مینا مجھے حسب معمول کمرے میں ملی۔ والہانہ میرا سواگت کیا۔

جب میں چائے پی رہا تھا تو وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

''یاور صاحب!'' (وہ مجھے شروع دن ہی سے یاور صاحب کہتی تھی)

''حکم جناب!''

''مجھے آپ سے بہت ساری معافی مانگنا ہے۔''

''مانگ لیجیے۔'' میں نے شرارت سے اسے تنگ کیا۔

''اگر بات بہت بگڑ جاتی؟ آپ میرے رویے کے بارے میں مجھ سے سختی سے پوچھ پڑتال تو کر لیتے۔ آپ نے مجھ سے کچھ پوچھا کیوں نہیں؟''

''کیا پوچھتا؟ تمھارے انداز میں اتنی دلآزاری ہوتی تھی ہمت جواب دے جاتی

تھی۔ تم تو پہلی شب سے ہی.....'' میں رک گیا۔ اسے شرمندہ کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

''یاور صاحب!''

''اوں ہوں، یا تو یاور کہو یا صاحب۔ صرف ایک چیز۔'' میں اندر ہی اندر حیران تھا مگر باہر سے مطمئن تھا۔

''میرے منہ سے نہیں نکلتا۔'' اس کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ مجھ پر قیامت گزر گئی۔

''میرا دل آپ کی جانب سے صاف نہیں تھا۔'' وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

''کس گناہ کی پاداش میں؟'' میں نے چائے کا کپ تپائی پر رکھ دیا۔

''بھابی جان نے کہا تھا کہ آپ مجھ سے اس لیے شادی کر رہے ہیں کہ بھائی جان کے پاس میرے جہیز کے لیے رقم نہیں تھی۔''

''یہ تم سے خالہ جان نے کہا تھا؟'' میں غصے سے کھول اٹھا۔

''جی۔'' وہ کچھ ڈر سی گئی۔

''اب کیا انھوں نے صفائی میں خط لکھا ہے؟'' (اس کے بدلے ہوئے رویے کے سبب یہ سوال کرنے کا جواز تھا)

''نہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

''پھر.....؟''

''آپ کے اظہارِ محبت نے خود ہی اصلیت آشکارا کر دی۔'' وہ شرمگیں مسکراہٹ سے گویا ہوئی۔

''ہیں.....'' مجھے اپنا کوئی خاص عمل یاد نہ آیا (البتہ اسے پانے کے سفر کی کہانی انہی دنوں اسے سنا ڈالی تھی)

''جب مجھے شام کو آپ گجرے پہناتے ہیں۔ تو آپ کے جذبوں کی ایک ایک لہر میرے وجود میں اتر جاتی ہے۔ پھول پہنانا انھیں ہی یاد رہتا ہے جو کسی کو بہت یاد رکھتے ہوں۔ مجھے ایک دن خود بخود احساس ہوا کہ جیسے بھابی جان نے مجھ سے غلط بیانی کی ہو۔ معاف کیجیے گا۔''

وہ مجھے دیکھتے ہوئے کچھ جھینپ کر مسکرائی۔

''پھر جب آپ نے پچھلی باتیں بتائیں تو یقین آ گیا کہ.....'' معاً وہ ایک دم اٹھی۔

''یہ دیکھیے۔ حالات کتنے نازک ہو گئے تھے۔''

اس نے دراز میں سے ایک کاغذ نکال کر میری سمت بڑھایا۔ میں نے الجھتے ہوئے کاغذ پر نگاہ دوڑائی۔

''بھابی جان محترمہ!

السلام علیکم

خیریت غیر موجود، خیریت مطلوب۔ کافی دنوں سے مجھے گھر سے کوئی خط نہیں آیا۔ سوچتی ہوں شاید آپ سب نے مجھے بھلا دیا ہے۔ بھلا دینے کے عمل میں جاتا ہی کیا ہے۔ یہ خط میں بہت مجبوری کی حالت میں لکھ رہی ہوں یقیناً آپ اسے پڑھ کر دکھی ہی ہوں گی۔ بھابی جان! اس ''شاہی قلعے'' میں دم گھٹ جائے گا میرا۔ آپ نے ترس..... کھانے والوں سے میری شادی کر کے مجھ سے کس گناہ، کس جرم کا بدلہ لیا ہے۔

یاور کا جو رویہ میرے ساتھ ہے۔ اس میں ان کا کیا قصور۔ جذباتی فیصلے تو پچھتاوے ہی دیتے ہیں۔

''ترس'' کا جذبہ اتنا طاقت ور تو نہیں ہوتا کہ زندگی بھر کی گاڑی کھینچی جا سکے۔ ان کا سرد رویہ مجھے روگ لگا دے گا۔

خدارا مجھے بلا لیجیے۔ ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا۔ سب کو درجہ بدرجہ سلام و دعا۔

فقط مینا''

میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

میں نے مینا کی سمت دیکھا۔ اس نے مسکرا کر خط میرے ہاتھ سے لے لیا اور پُرزے پُرزے کر دیا۔

''لیکن قصور تو تمھارا ہے۔ تمھارے رویے میں اتنی سرد مہری تھی۔ میرے حوصلے کیسے بڑھتے؟'' اب مجھے سچ مچ غصہ آ گیا تھا۔

''میں نے تو اپنا رویہ اس لیے سرد کیا تھا کہ آپ مجھ سے ''وجہ'' پوچھیں گے تو میں دل کا سارا غبار نکال دوں گی۔ کیونکہ مجھے شک سا تھا کہ بھابی جان نے کہیں اپنے طور پر ہی یہ بات نہ کی ہو۔ لیکن جب آپ نے میرے ''برے رویے'' کے بارے میں کچھ پوچھا نہیں

تو مجھے یقین آنے لگا تھا۔ آپ خود ہی سوچیے کیا یہ کسی لڑکی کے لیے باعث توہین نہیں کہ اس پر ترس کھا کر اپنایا جائے۔ کیا اس میں کوئی ایسی صلاحیت نہیں کہ وہ کسی کی زندگی میں اہم کردار ادا کر سکے۔

لیکن آپ کے گذشتہ دنوں کے رویوں نے آپ کا خلوص ظاہر کیا اور انہی لمحوں میں بہت خوبصورت انکشاف بھی ہوئے تو.....''

''تم مجھے موقع تو دیتیں۔ یہ انکشافات تو بہت شروع میں ہو جاتے تم پر۔'' میں نے بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ وہ شرما گئی۔

''تم نے تو مجھے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اور سنو تم سے یہ بات خالہ جان نے شادی سے پہلے کہی تھی۔ یا بعد میں؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے کہی ہوتی تو شاید میں شادی سے ہی انکار کر دیتی۔'' وہ آہستگی سے مسکرائی۔

''ہاں بھئی، بہت ''دبنگ'' ہو تم، جانتے ہیں۔'' میں نے چھیڑا۔

''او خدایا یہ کیا ہونے جا رہا تھا۔'' میرا دل دہل گیا۔

''برصغیر بلکہ دنیا میں یہ نازک رشتے کیا کیا گل کھلا سکتے ہیں۔ مجھے خالہ جان سے سخت شکایت پیدا ہو چکی تھی۔ انھوں نے حسد میں یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ اپنی نند کا نہیں بلکہ اپنے بھانجے کا بیڑا غرق کرنے چلی تھیں۔ اس بحران سے نکلنے پر میرا دل خدا کے حضور سجدۂ شکر بجا لا رہا تھا۔ (مجھے کیا خبر تھی کہ میں اپنی اَنا اور وہ غلط فہمی کے جہنم میں سلگ رہی تھی)

پھر مجھے وہ نیلی آنکھیں کہیں نہیں ملیں۔ کہیں نظر نہ آئیں۔

ایک روز چورنگی پر ایک نوجوان لڑکا گجرے بیچ رہا تھا۔ میں نے اس بچے کے بارے میں اس سے دریافت کیا۔ اس نے روح فرسا خبر سنائی کہ وہ اسی چورنگی پر ایک حادثے میں جاں بحق ہو گیا ہے۔ سرکار نے اس کے گھر والوں کو معاوضہ دلایا ہے۔ وہ پکے گھر میں چلے گئے ہیں۔ اس کی ماں نے گھر میں ہی پرچون کی دکان کھول رکھی ہے۔ بعض انسانوں کی موت بھی کتنی فیض رساں ہوتی ہے۔ دُکھ سے میری آنکھیں بھیگ چلی تھیں۔

اسے دیکھ کر ایک بار میں نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا۔ ''اے اللہ! تو تو مجھ سے زیادہ، ہزار گنا زیادہ محبتوں کا تقسیم کار ہے۔ اس بچے کا کیا مصرف ہے اس دنیا میں؟ کیا یہی کہ آلام کے آلاؤ میں دہکتا رہے۔ خوشامدیں کر کے پھول بیچتا رہے؟''

میرے ضمیر کے گنبد میں کلام حق کے الفاظ گونجے کہ اللہ نے کوئی شے بلاوجہ نہیں بنائی۔ مجھے اپنے گھر کے در و دیوار روشن دکھائی دیے۔ جن کا سبب وہ معصوم مرحوم تھا۔

''کیا تمھیں اس کی قبر کا پتا ہے؟'' میں نے لڑکے سے دریافت کیا۔

''جی صاحب! وہ ہمارے محلے میں رہتا تھا۔ آپ چلیں گے؟'' اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔

''ہاں۔ چلو۔''

میں نے دوسری سمت کا دروازہ کھولا۔ گجروں سے ایک گلاب کسی دن ٹوٹ کر ڈیش بورڈ پر پڑا رہ گیا تھا۔ قبرستان میں گاڑی روکتے ہوئے میں نے وہی گلاب مرقد پر رکھنے کے لیے اٹھا لیا۔

مرجینا

میں شہر کا مشہور و معروف بیرسٹر ہوں۔ میری شہرت کی دو اہم وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں کامیاب بیرسٹر ہوں۔ دوسری وجہ شہرت یہ ہے کہ کثیر الازدواج ہوں۔

آپ یہ نہ سمجھ لیجیے گا میں کوئی شوقین قسم کا آدمی ہوں اور مجھے شادیوں کا بہت شوق رہا ہے۔ جی نہیں۔ ہرگز نہیں۔ دراصل میں جنم دن سے ہی تین عورتوں کے نرغے میں رہا ہوں۔ ماں کو نہیں دیکھ پایا۔ سُنا ہے بھلی عورت تھی۔ بس ماں تو مجھے جنم دے کر حقیقی ٹھکانے سدھاری اور میں تین عورتوں، میرا مطلب ہے تین بہنوں کے نرغے میں آ گیا۔

سب سے چھوٹا تھا۔ تین بہنیں لاڈ اٹھانے میں کسر نہ چھوڑتی تھیں۔ دنیا میں اگر کہیں لاڈ بک رہے ہوتے یا یومیہ کرائے پر مل رہے ہوتے تو مجھے یقین ہے وہ اُدھار بھی مانگ لاتیں۔ بہرحال انھوں نے ابا جی کے ساتھ مل کر میری تربیت پر بھی بہت محنت کی۔ انہی کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے کہ آج میں ایک معزز شخص ہوں۔

رہی بیگمات کی بات تو اتنا بتا دوں میری طبیعت میں بے صبری اور برہمی وخود سری بہت ہے۔ والد مرحوم نے میری شادی اپنی بہن کی بیٹی کے ہمراہ کی۔ اس شادی پر میں پہلے ہی معترض تھا کیونکہ پھوپھی زاد ہونے کے ناتے میں انھیں خوب اچھی طرح جانتا پہچانتا تھا۔ بالکل اللہ میاں کی گائے بلکہ موم کی ناک۔ جدھر چاہے موڑ دو۔ میں ایک سوشل آدمی تھا۔ بیوی بھی ایسی ہی چاہتا تھا جسے محافل میں میری عزت رکھنا آتی ہو۔ مگر وہی ہوا جو ابا جی نے چاہا تھا۔ انوری بیگم، بیگم عقیل بن کر میرے لان میں اتر آئیں۔ (مجھ ناچیز کو عقیل کہتے ہیں) مگر مجھ میں، ان میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ذہنی اختلافات کا کوئی شمار نہ تھا۔

مجھے ان سے خاص دلچسپی نہ تھی۔ وہ میرے ماتھے کے بل دیکھ کر بات کرتی تھیں۔ حد سے زیادہ بزدل۔ بہت دنوں تک وہ مجھے محویت سے دیکھا کیں۔ غالباً انھیں

یقین نہیں آتا تھا کہ اتنا پڑھا لکھا معزز انسان ان کا شوہر ہے۔ کیونکہ وہ خود اسکول سے آٹھویں جماعت سے اُٹھ گئی تھیں۔

ایک بار خلوتی لمحات میں انھوں نے انکشاف کیا تھا آٹھویں میں حساب کا پرچہ رہ گیا تھا۔ وگرنہ میٹرک کرنا کوئی مشکل بات تو نہیں تھی اور میں نے کمال ضبط سے چہرے پر آنے والے ہر ردِعمل کو روکا تھا۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ان سے مجھے کوئی اولاد نہ مل سکی اور میں نے اسی بات کو ڈھال بنا کر دوسری شادی کا اعلان کر دیا۔ بیگم مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرمہ تھیں۔ ہوسکتا ہے روئی ہوں۔ مگر مجھ پر اظہار نہ کیا۔

میرے ایک استادِ محترم تھے۔ نہایت قابل بیرسٹر میں نے انھیں کے ماتحت وکالت شروع کی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان دوستانہ روابط تھے۔ وہ میرے خیالات سے اور میرے گھریلو حالات سے واقف تھے۔ میں نے ان کے سامنے اپنا فیصلہ رکھا تو اوّلین انھوں نے مجھے سمجھایا کہ اپنی ان ہی بیگم کو پسندیدہ رُوپ میں ڈھالنے کی کوشش کروں۔ میں نے انھیں باور کرایا۔ یہ اب مشکل ہے جبکہ میرے ہاں اولاد بھی نہیں ہے۔ اس طور میں دوسری شادی کرنے میں حق بجانب ہوں۔ میرے انداز میں قطعیت تھی۔

استادِ محترم کافی دیر مجھے غور سے دیکھتے رہے پھر گویا ہوئے۔

''میاں! میری ایک بھانجی ہے۔ عمر بہت کم ہے۔ میری بہن کا انتقال اس کی پیدائش کے بعد ہو گیا تھا۔ میرے بہنوئی نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اب صورت حال یہ ہے بچی سخت مشکل میں ہے۔ سارے گھر کا بار اس پر ڈال رکھا ہے۔ اگر میں یا میری والدہ اسے اپنے پاس لانا چاہتے ہیں تو میرے بہنوئی رضا مند نہیں ہیں۔ تمھیں سالوں سے میں جانتا ہوں اور تمہاری شرافت ونجابت کا قائل بھی ہوں۔ روپیہ پیسہ خدا نے خوب دیا ہے۔ میں تمھیں مشورہ دوں گا کہ اپنی بیوی کو طلاق مت دو۔ اور اگر چاہو تو میری بھانجی بہت موزوں ہے۔ نہایت ذہین و تیز فہم۔ بی۔ اے تک ہم لوگوں نے زبردستی تعلیم دِلائی ہے وگرنہ ان کا ارادہ نہیں تھا اسے پڑھانے کا۔ بہت خاموش طبع وصلح جو ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ اس کی ماں اسے بغیر دیکھے کہیں اٹھا پھینکے۔ تم موزوں آدمی ہو بلکہ میرے نزدیک موزوں ترین۔''

استادِ محترم نے بھانجی کی اتنی تعریف کی کہ میرا بس نہ چلتا تھا۔ ابھی دو بول پڑھوالوں۔

مجھے استادِ محترم پر پورا بھروسہ تھا۔ میں نے لڑکی دیکھنے کی ضد نہ کی۔ ان کے بقول تقدیر سے کہیں زیادہ اچھی شکل ہے۔

بڑی بہن میرے نزدیک ہی رہتی تھیں میں نے انہیں باخبر کر دیا۔ وہ ہانپتی کانپتی آ پہنچیں۔ میری بیوی کے گلے لگ کر رُونے لگیں۔ میں ان روتی بسورتی عورتوں کو دیکھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر انہیں ہوا کیا ہے۔

''دیکھو عقیل..... تمہیں میری جان.....''

''بس کیجیے آپا! تباہ کر رکھی ہے میری زندگی۔ کوئی ضرورت نہیں قسم وسم دینے کی۔ اب یہ فیصلہ ہو چکا ہے۔ میں انھیں طلاق تو نہیں دے رہا۔ پورے گھر پر ان کا اختیار ہے۔ ماہانہ ہمیشہ ملے گا۔ پھر تکلیف کس بات کی ہے۔'' میں بگڑ کر بولا۔

آپا نے دانشمندانہ انداز میں میرا جائزہ لیا۔ پھر ٹھنڈی سانس چھوڑ دی۔ گویا سُپر ڈال دی۔ نکاح میں گنے چنے رشتے دار تھے۔ رخصتی دو ماہ بعد تک ملتوی کر دی گئی۔

اب میں نے نئے سرے سے اپنے ملبوسات کا جائزہ لیا۔ بڑے بے اہتمام لباس زیب تن کرتا تھا۔ اس عورت کی سنگت میں تو قبل از وقت بوڑھا ہو چلا تھا۔

دلہن کے ملبوسات کے ساتھ ساتھ میں نے اپنے بھی کئی سوٹ جدید تراش خراش کے تیار کرائے۔ طبیعت میں ایک عجیب سی سرشاری رچ بس گئی تھی۔

استادِ محترم دو ماہ کے لیے فرینکفرٹ گئے تو ان کی ذمہ داریاں بھی میری جانِ ناتواں پر آ پڑیں۔

اور ایک روز جب تھکا ہارا گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک صاحب اندر داخل ہوئے۔ شکل سے اچھے گھر کے نظر آتے تھے۔ آتے ہی سلام کیا۔ انتہائی گرمجوشی سے، شاید معانقہ کرنا چاہتے ہوں۔ مگر میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''کہیے جناب! کیسے تکلیف کی۔'' میں نے کرسی پر ڈٹ کر پیشہ ورانہ اسٹائل میں دریافت کیا۔

''پہلے تو یہ فرمایئے۔ آپ ہی عقیل دُرانی ہیں؟''

''جی صاحب، ناچیز کو عقیل دُرانی کہتے ہیں۔''

''آپ کا نکاح شیخ نورالزماں کی صاحبزادی عالیہ بیگم سے ہوا ہے؟''

''جی ہاں!'' میں نے بہت دلچسپی سے ان محترم کو دیکھا۔

''میں ان کا کزن ہوں۔''

''بڑی خوشی کی بات ہے۔'' میری نظریں ان کا طواف کر رہی تھیں۔

''اور آپ کا ہمدرد بھی۔'' وہ مزید گویا ہوئے۔

''جی!'' میں چونک سا گیا ان کے لہجے پر۔

''آپ غالباً اپنی پہلی بیوی سے عدم اتفاقی کی بنا پر دوسری شادی کر رہے تھے۔ مگر صاحب! آپ ایک مصیبت سے نکل کر دوسری مصیبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ غالباً آپ لاعلم ہیں کہ آپ کی منکوحہ کی بائیں ٹانگ میں نقص ہے جس کی بنا پر وہ چال میں توازن نہیں رکھ پاتیں۔ میں ان کا قریبی رشتہ دار ہوں اور آپ دونوں کا ہمدرد۔ چند دن قبل وطن آیا ہوں اور معلوم ہوا کہ آپ جیسے معزز آدمی کو دھوکہ دیا گیا ہے۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔

''ویسے ثواب کا کام ہے۔ خدا آپ کو اس نیکی کا اجر عظیم عطا کرے۔'' تھوڑی دیر بعد وہ حضرت مصافحہ کر کے چلے بھی گئے اور میں گم صم بیٹھا رہ گیا۔ گویا استادِ محترم بھانجی کی محبت میں میرا بیڑا غرق کر گئے تھے۔ میں مارے افسوس کے اپنی کرسی پر سے نہ اُٹھ سکا۔ جیسے میرا وجود بے جان ہو گیا ہو۔ میری نظروں میں استادِ محترم کا شفیق و پُروقار چہرا گھوم رہا تھا۔ خدایا کس پر اعتبار کیا جائے؟ کیسے کسی کو پہچانا جائے؟ کیا ہے یہ دنیا؟

مگر میں ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہوں۔ بہت جلد بھڑک اُٹھتا ہوں۔ میں نے بھی استادِ محترم کو سبق دینے کی ٹھان لی۔

اپنی بیگم کو تمام بات بتا دی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا۔ ''خوش مت ہو جانا..... وہ نہیں تو کوئی اور سہی، سارے زمانے کی لڑکیاں تو لنگڑی نہیں۔''

میں تو اپنے بے وقوف بنائے جانے پر کچھ زیادہ ہی تپ رہا تھا۔ استاد کی قسمت اچھی تھی۔ ان کا کئی دنوں تک فون بھی نہ آیا، وگرنہ اچھی خاصی تلخ کلامی ہو جاتی۔

جمعہ کو ضرورتِ رشتہ کے کالم کو بہت اہتمام سے پڑھتا تھا۔ ایک اشتہار میرے دل کو چھو گیا۔

''خوبصورت و خوب سیرت، اعلیٰ خاندان، امریکہ میں مقیم، عمر تقریباً تیس سال۔

بیرون ملک قیام کی وجہ سے شادی میں تاخیر ہوتی رہی۔'' اور جانے کیا کیا لکھا تھا۔ آخر میں تحریر تھا'' دوسری شادی کے خواہش مند بے اولاد افراد بھی رجوع کر سکتے ہیں۔''

اور میرے مشتعل و منتقم ذہن نے یہاں قسمت آزمائی کی ٹھان لی۔

میں استادِ محترم کی آمد سے قبل یہ کام کر لینا چاہتا تھا۔

لڑکی کے بھائیوں اور ماں سے ملا۔ لڑکی سے ملاقات رہی۔ انتہائی خوبصورت و جامہ زیب۔

میرے ذہن سے انوری بیگم و عالیہ بیگم بالکل مٹ گئیں۔ میں نے سب کچھ انھیں سچ سچ بتا دیا۔ لڑکی کے بھائی میری صاف گوئی سے بے حد متاثر ہوئے۔ میں نے انھیں یقین دلایا میں دوسری منکوحہ سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔ بس ان کے ماموں کا انتظار ہے۔

اور ایک شام روحینہ شکوہ، روحینہ عقیل بن کر میرے گھر آ گئیں۔ خالص حیدر آباد سے متعلق ہیں۔ ''خ'' اور طنطنہ نکاح میں بندھ کر میرے ہمراہ آیا ہے۔ شروع میں ان کے ''خ'' سے میں بڑا پریشان رہا۔

شادی کے اوّلین دنوں میں انھوں نے کسی وجہ سے مجھے پکارا۔

''عقیل صاحب!''

اور میں شیو بناتے بناتے تپ کر رہ گیا تھا۔ بخیل صاحب! ہونہہ۔ جس مزاج بری چیز نہیں مگر یہ کیا کہ بخیل صاحب ٹھیک ہے زمانہ طالب علمی میں ابا جی کے عطا کردہ محدود جیب خرچ کی وجہ سے میں دوستوں کی مدارات سے اجتناب برتتا تھا جس بنا پر وہ مجھے بخیل کہہ دیا کرتے تھے۔ مگر ان کے پاس کیا کمی چھوڑی ہے..... آخر شوہر ہوں۔ وہ بھی ملازموں کے سامنے..... بخیل صاحب.....! حد ہو گئی صاحب!

''میں بولی کن خیالاں میں گم ہیں عقیل صاحب!'' وہ اس بار بلند آواز سے بولیں۔

''بہت ترے کی۔'' میں کھسیا کر رہ گیا تھا۔ اب تو ان سے اور ان کے ''خ'' سے سمجھوتہ ہو چلا ہے۔ روحینہ شکوہ انٹر پاس تھیں۔ بس طرحدار بہت تھیں۔ انگریزی پر عبور رکھتی تھیں۔ مگر بہت کوشش کے باوجود اردو ان کی حیدر آبادی آغوش میں ہی رہتی تھی۔

ٹھیک اس شادی کے ڈیڑھ ماہ بعد اُستادِ محترم وطن واپس لوٹ آئے۔

میری یہ شادی مکمل خاموشی سے ہوئی تھی۔ ابھی باہر اس کی ہوا نہیں لگی تھی۔

میں بہت سرد مہری سے استاد صاحب سے پیش آیا۔ انھوں نے واضح طور پر محسوس کیا۔ ان کا ردِعمل ان کے احساسات کا مظہر تھا۔ کافی دیر بعد میں نے کہنا شروع کیا۔

''عباد صاحب! مجھے کس قدر دُکھ ہوا یہ جان کر کہ آپ جیسی معزز ہستی بھی کسی کو دھوکہ دے سکتی ہے۔ اور اب میرے لیے ناقابل برداشت ہے کہ میں آپ کے ہمراہ کام کروں اگرچہ مجھے بہت افسوس ہے مگر میں مجبور ہوں۔ مگر تھوڑی سزا آپ کا حق بھی ہے۔ میں عالیہ بیگم کے طلاق کے کاغذات تیار کر کے پوسٹ کر دوں گا۔''

''کیا کہہ رہے ہو..... میاں.....؟'' وہ بے اندازہ پریشان ہو گئے۔

''میں ایک تعلیم یافتہ بیوی مسلم اعضاء کے ہمراہ چاہتا تھا۔ وگرنہ میری پہلی بیوی عادت کی بُری نہیں۔ نہ ہی اپاہج ہیں۔ میں نے آپ پر واضح کر دیا تھا کہ میں دوسری شادی شوقیہ نہیں حالات کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کر رہا تھا۔ بہرحال جو ہونا تھا ہو چکا۔ میں شادی کر چکا ہوں..... اور..... عالیہ بیگم۔''

''کیا کہہ رہے ہو بھئی۔ صاف صاف بات کرو۔'' استادِ محترم کا چہرہ شدتِ جذبات سے سُرخ ہو رہا تھا۔ میں طنزیہ مسکرایا..... ''اور کیا صفائی باقی ہے.....؟''

اور عباد صاحب تمام ماجرا سُن کر سر ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گئے..... ان کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

''میاں، تم جیسے پڑھے لکھے بُردبار آدمی سے مجھے اس قدر جذباتیت کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔

''وہ بچی واقعی بدنصیب ہے۔'' ان کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ ''میاں، کم از کم میرے آنے کا تو انتظار کیا ہوتا۔''

اور جو کچھ عباد صاحب نے بتایا سن کر میرا دل بیٹھنے لگا۔

انھوں نے بتایا کہ وہ نوجوان جو میرے پاس آیا تھا وہ عالیہ کا طلبگار تھا مگر اس کا اُٹھنا بیٹھنا غلط لوگوں میں تھا، اس لیے انکار کر دیا گیا تھا۔ یہ اس کی انتقامی کارروائی تھی۔

لمحے بھر کو تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔

اور اس قدر خفت و ذلت اور شرمندگی میں نے محسوس کی کہ خود کو شوٹ کر دینے کو جی چاہا۔

میں نے استادِ محترم کے پاؤں چھو کر معافی مانگنا چاہی تو میری آواز بھرا گئی۔
مگر عباد صاحب کو ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد یہ کہہ کر چلے گئے۔

''کاش میرا کوئی بیٹا ہوتا تو شاید یہ بچی اس قدر دُکھ نہ اٹھاتی۔''

اور اس روز میں صرف آنسو پیتا رہا۔ ایسا لگتا تھا میرے دائیں جانب انوری بیگم ہاتھ اٹھائے بددعاؤں کے انگارے برسا رہی ہیں اور بائیں جانب عالیہ کا آنچل پھیلا ہے اور اس کے آنسو رکتے نہیں۔

گھر آ کر میں بہت بے چین رہا۔ روحینہ میرا جائزہ لیتی رہیں۔ دوسری رات بھی جب انھوں نے یہی منظر دیکھا تو رہا نہ گیا۔

''میں بولی..... وکیل صاحب! خیر خیریت تو ہے نا۔ کوئی بڑا مخدمہ ہے کیا؟''
(وکیل صاحب خیریت تو ہے۔ کوئی بڑا مقدمہ ہے کیا؟)

میں نے سر اٹھا کر انھیں دیکھا۔ سبز ریشمی ساڑھی تھی اور خوبصورت تر و تازہ چہرے پر تشویش تھی۔

ان کی ناک ہیرے کی لونگ سے بے حد سج رہی تھی۔ وہ میرے سامنے ایک غمگسار ساتھی کی طرح کھڑی تھیں۔ میری ہمت نہیں پڑتی تھی انھیں حقیقت حال کہنے، بتانے کی..... بہرحال عیاں تو کرنا تھا۔

وہ میری آنکھوں میں تیرتا پانی دیکھ کر سخت ہراساں ہو گئیں۔

''اصل بات بتائیں۔ میں بڑی پریشان ہو رہی ہوں۔ بول دی میں۔'' انھوں نے تیکھے پن سے کہا۔

اور میں نے اصل بات بتا ہی دی۔

''اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ ان کے رشتہ داروں کی لگائی آگ ہے۔ آپ کی جگہ پو کوئی ہوتا یہ اِچ کرتا..... دیونصیباں ماری کو طلاخ..... فخر کی کیا بات ہے۔''
(فکر کی کیا بات ہے)

''روحینہ بیگم! عالیہ بے قصور ہے۔'' میں نے انھیں احساس دلایا۔

''مطلب کیا ہے آپ کا۔ بے خصور ہے۔ گھر لے آئیں گے اُسے.....؟'' اچھی

طراں سمجھ لیں۔ آپ اسے طلاخ دیں گے..... اللہ ماری میری جان پو کیوں عذاب ہو۔ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے..... نئیں بابا..... سیدھے سیدھے طلاخ بولو۔

''نئیں ہوگا ہم سے برداشت۔ ہائے میری دُکھیا جان کن عذاباں میں پڑ گئی۔ پیچھے سوکن..... آگے سوتن.....

اُنوں کی بددعا کا اِتا خیال..... میری جان جو آپ کی جان روئی گی..... خدا کا خمر (قہر) نہ ٹوٹے گا اس گھر پو۔'' وہ رونے لگیں۔

صورت حال سخت سنگین ہو گئی تھی۔

اگلے روز آفس پہنچا تو نئی مصیبت سر پر کھڑی تھی۔ عالیہ کے والد طیش میں کف اُڑا رہے تھے۔ عباد صاحب اور مجھ پر مقدمہ کرنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ اور فی الفور طلاق مانگ رہے تھے۔ وگرنہ دوسری صورت میں جلد ہی وہ مجھ پر مقدمہ دائر کرنے والے تھے۔

آواز بلند کہہ رہے تھے۔ ''آج ہی پرچی داخل کراتا ہوں میاں۔''

میں نے صفائی پیش کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ کچھ سننے پر تیار نہ تھے۔

میں نے گھر آ کر روحینہ و انوری بیگم کو تمام بات بتائی۔ انوری بیگم تو مقدمے کا سن کر ہی رونے لگیں۔ روحینہ الگ خوفزدہ ہو گئی تھیں۔ مگر عالیہ کو بھی کسی طور برداشت کرنے پر راضی نہ تھیں۔

کیونکہ میں نے شادی کے وقت کچھ نہ چھپایا تھا اس لیے روحینہ بیگم کا تو مجرم نہ تھا۔

اور پھر مجھے ہر لمحے سمن کا انتظار رہنے لگا۔ میں نے حالات کا سامنا کرنے کی ہمت پیدا کر لی تھی۔

اور اگلے روز میں سخت منتشر ذہن کے ہمراہ آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔

کہ چپڑاسی نے ایک سفید لفافہ لا کر دیا۔

میں نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ شاید میں عدالت کی مہر دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر لفافے پر صرف میرا نام تحریر تھا۔ چپڑاسی نے بتایا کہ ایک بی بی دے گئی ہیں۔

میں نے ایک تذبذب کے عالم میں لفافہ کھولا۔

بڑی خوبصورت ہینڈ رائٹنگ تھی۔

وکیل صاحب!

السلام علیکم!

خدائے لازوال سے آپ کی صحت و عافیت کے لیے دعا گو ہوں۔

اس سے پہلے کہ آپ حیران ہوں تعارف کرا دوں اپنا۔ مجھے عالیہ بیگم بنت نورالزماں کہتے ہیں۔ مورخہ 21 جنوری کو میرا عقد آپ کے ہمراہ ہوا تھا اور اب میں آپ کی منکوحہ ہوں۔ میرے گھر والے آپ پر مقدمہ چلانے کے لیے مُصر ہیں۔ میرا دل نہیں مانتا۔ آپ میری زندگی میں آنے والے پہلے اور آخری مرد ہیں۔ آپ کے ماضی سے متعلق جان کر بھی مجھے آپ سے منسوب ہو کر خوشی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ مجھے امید نہیں تھی کہ میرے نصیب میں آپ جیسا باوقار انسان لکھا ہے۔ میں نے بچپن سے کچھ ایسا وقت گزارا ہے کہ بیان سے باہر ہے اور آپ پر مقدمہ دائر کرنا گویا طلاق حاصل کرنا ہے۔ اور اب مجھے خوف آتا ہے کہ مطلقہ ہو جانے کے بعد خدا جانے میرا نصیب پھر کن کن آزمائشوں میں پڑتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ میں اسی شخص کے ہمراہ رہوں جسے میرا دل و ذہن قبول کر چکا ہے۔ اور ظاہر ہے جب میں ایسا نہیں چاہتی تو مقدمے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ میرے یہ خیالات بے شک میرے والدین تک پہنچا دیجیے کیونکہ بہرحال میری حیا اس طرح کی گفتگو کرنے میں مانع ہے۔ مگر ان سے بھی میں مقدمہ دائر کرنے سے متعلق اختلاف رکھتی ہوں۔ میں نے قلم اٹھانے کی جرأت صرف اس لیے کی ہے کہ موسم اَلم بدلتا نہیں تو پھر اس کی صورت ہی بدل جائے۔ آپ کے وجود کے سائے میں ہر اَلم منظور ہے۔

میں آپ کو قصور وار نہیں سمجھتی۔ شاید کوئی اور ہوتا تو اس سے زیادہ کر گزرتا۔ یعنی مجھے طلاق دینے میں لمحہ نہ لگاتا، بہرحال اب جو بھی کچھ ہوا ہے کم تو نہیں ہے۔ بہرحال.....!

ناچیز۔ عالیہ!

اور پھر میں..... روحینہ بیگم کی طرف سے بالکل غافل ہو کر استادِ مکرم کے دولت کدے پر حاضر ہوا۔ ان سے تفصیلاً بات چیت رہی۔ شب ایک بجے تک میں ان کے پاس رہا۔ رات ایک بجے کے بعد جب گھر پہنچا تو انوری بیگم پورچ میں کھڑی تھیں۔

''آج بہت دیر ہو گئی؟'' جیسے ہی میں گاڑی سے اترا انھوں نے تشویش سے پوچھا۔

''ہوں۔'' میں نے ان کی جانب دیکھا اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''بس کام زیادہ تھا۔ جاؤ۔ تم سو جاؤ اب۔'' وہ چلی گئیں۔

میں اپنے کمرے میں آیا تو روحینہ پیشانی شکن آلود کیے ایزی چیئر پر دراز تھیں۔

''گھر میں فون ہے۔ فون ہی کر دینا چاہیے۔ ہولتا ہے دل کہ خدا معلوم کیا بات ہے۔''

''ارے بھئی، معاملہ ذرا اُلجھا ہوا تھا بس دھیان نہیں رہا.....''

''کون سا معاملہ؟ عالیہ بیگم والا.....؟'' انھوں نے گہری نگاہ سے مجھے دیکھا۔

''اب کیا بکتے ہیں؟'' تیکھے لہجے میں سوال آیا۔

''کچھ نہیں۔'' میں نے کچھ نہیں کے بعد بہت کچھ کہنا چاہا۔

اور پھر میں نے جو کہنا چاہا تھا کہہ دیا بہت محبت و عجز سے۔

مگر وہ بپھر گئیں۔ ''میں آپ کو کتنا سمجھائی انوں کو فوراً طلاخ دیو..... مگر..... ایسا کبھی نئیں ہوئے گا۔ سمجھ رئے ناں آپ.....؟''

مجھے اُن سے اسی جواب کی توقع تھی۔

میں نے ان کے ہاتھوں کو تھام کر کہا۔ ''گنہگار میں ہوں۔ خطاکار میں ہوں۔ اگر میں نے طلاق دے دی تو ضمیر کے نیزے پر رہوں گا۔ میری سماجی و معاشرتی زندگی بُری طرح متاثر ہو گی بلکہ شاید ہر وقت کے احساسِ ندامت سے میری دماغ کی رگ پھٹ جائے گی۔

تم سب لوگ مجھے جی بھر کر سزا دو۔ میں زندگی بھر اس جلد بازی کا تاوان ادا کرتا رہوں گا۔

وہ آنا چاہتی ہے اسے قبول کر لو۔ وہ اور کچھ نہیں مانگے گی۔''

اور پھر مجھ جیسے اَنا پرست آدمی نے روحینہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے کہ ضمیر کی آوازوں سے میرے اعصاب چیخ رہے تھے۔ روحینہ عورت تھیں۔ میری آنکھوں کا پانی اُن کے دل میں اُتر گیا۔

وہ کچھ نہیں بولیں۔ بس میرے سینے سے سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ ''ظلم تو میرے ساتھ بھی ہو رہا ہے۔ میرے لیے آپ کا ضمیر کیا کہتا ہے؟''

''روحینہ! میرا تم سے وعدہ ہے کبھی تمہاری حق تلفی نہ ہو گی۔ بلکہ شاید آج سے میرے دل میں تمہارا مقام بلند ہو جائے۔''

''اپنے بھیّوں کو کیا بولوں گی۔'' آپ کیا جواب دیں گے؟''

''تو کیا تم میرا ساتھ نہ دو گی۔''

وہ خاموش ہو رہیں۔ بس میرے شانے سے لگی سسکیاں بھرتی رہیں۔

اور پھر عالیہ آ گئیں۔ وہ ضرورت سے زیادہ سمجھ دار نکلیں۔ انوری بیگم اور روحینہ شکوہ سے بصد احترام پیش آتیں۔ ان کی موجودگی میں مجھ سے ان کی بے نیازی کا عجیب عالم ہوتا۔

روحینہ شکوہ کو میں دو ہزار روپے ماہوار دیتا تھا۔ زمینوں کی آمدنی انوری بیگم کے پاس آتی تھی۔

عالیہ کو میں نے پہلی مرتبہ دو ہزار روپیہ دیا تو ڈیڑھ ہزار انھوں نے مجھے واپس لوٹا کر کہا۔ ''سب کچھ تو گھر میں موجود ہوتا ہے۔ گاڑی میں آنا جانا ہوتا ہے۔ وہ بھی کبھی کبھار۔ بس یہ کافی ہیں۔ موسم کے لحاظ سے کپڑے ہی تو بنانے ہوتے ہیں۔ وہ بھی بس کتنے۔ ضرورت ہوگی تو لے لوں گی۔''

میں نے اس بات کا تذکرہ روحینہ سے کرنا ضروری سمجھا۔

''ہونہہ..... مظلوم ہیں سدا کی۔ خرچ کرنا کیا جانیں اب نوٹوں کی بیڑیاں تو بنا کر پہننے سے رہیں۔''

انھوں نے سر جھٹک کر حقارت سے کہا۔

پارٹیز میں زیادہ تر روحینہ ہی میرے ہمراہ ہوتی تھیں کبھی عالیہ کو کہتا بھی تو طرح دے جاتیں۔

سارے گھر کی ذمہ داریاں اپنے نازک کندھوں پر اٹھالی تھیں۔

مجھے وہ بات بھی اور باتوں کی طرح بھولتی نہیں جب انوری بیگم بیمار پڑ گئی تھیں۔ تب عالیہ نے کس دلجمعی سے ان کی تیمار داری کی تھی۔ ان کے لیے پرہیزی کھانا بنانا ان کی دوا کا دھیان رکھنا..... اور شاید انھوں نے انوری بیگم کی توجہ و محبت حاصل کر لی تھی۔

حسن اتفاق سے میری سب سے پہلی اولاد عالیہ سے ہے۔ ان دنوں جب وہ ان اہم مہینوں سے گزر رہی تھیں۔ انوری بیگم نے ان کا بے حد دھیان رکھا۔ عالیہ کے کام آگے بڑھ بڑھ کر کرتی تھیں۔

عالیہ کے چہرے پر چھائی زردی اور ان کے چلنے پھرنے میں تکلیف کا تاثر.....

انوری بیگم کی محبتوں میں چھپ جاتا تھا۔ یہ فضا میرے لیے سکون کا باعث تھی۔

اور اس کے لیے میں عالیہ کا ممنون تھا احسان مند تھا۔

ان دنوں میں عالیہ کو دیکھتا تو اپنی جلد بازی کے کیے گئے فیصلے پر پچھتا تا رہ جاتا۔

جب وہ اس گھر میں آئی تھیں تو بے حد نازک سی تھیں۔ اب ان کا جسم بھاری ہو رہا تھا۔ اس سے ان کی دلکشی میں نہ سمجھ میں..... آنے والا اضافہ ہو چلا تھا۔

وہ گھر میں بہت بے تکلف تھیں۔ انھیں کام میں مصروف دیکھ کر احساس تک نہ ہوتا تھا کہ وہ بٹواروں کی ستائی ہوئی ہیں۔

اور ایک روز مجھے بیٹے کی نوید ملی۔ میں بے انتہا خوش ہوا تھا۔

انوری بیگم عالیہ کے ہمراہ ہی تھیں۔ میں اور روحینہ اپنا بیٹا دیکھنے گئے۔ روحینہ نے کوئی تاثر نہیں دیا تھا۔ میں نے بڑی چاہ سے اس عظیم مراد کا نام مراد رکھا اور وہ زیادہ تر اپنے بیٹے میں مصروف رہنے لگیں۔

اس کے بعد روحینہ کے ہاں بیٹی ہوئی۔

روحینہ سے میری دو بیٹیاں اور عالیہ سے ایک بیٹا اور بیٹی ہیں۔

میں عالیہ کو دیکھتا ہوں۔ مجھے وہ عورت کی عظمت کا آسمان نظر آتی ہیں۔

میرے بٹواروں میں سے شاید سب سے بڑا بٹوارہ، سب سے بڑا نیزہ انوری بیگم کے حصے میں آیا تھا۔ جس نے ان کا دل لہولہو کر دیا تھا۔ اور وہ لہو ان کے منہ سے گرنے لگا تھا۔

روحینہ بیگم نے بچوں پر پابندی لگا دی تھی کہ وہ بڑی امی کے پاس نہ جائیں۔

مگر عالیہ وہ لہو اپنے ہاتھوں سے سمیٹتی تھیں۔

ان کی تیمار داری کرتی تھیں۔ ان کا بستر بدلتی تھیں۔ کمرے میں ایئر فریشنر چھڑکنا تک یاد رکھتی تھیں۔ ان کے تکیے پر گلابوں کے گجرے سجاتی تھیں۔ صبح اٹھ کر ان کے کمرے میں دھوپ لگانے کا اہتمام کرتی تھیں۔ انھیں لان میں بٹھا کر ان سے باتیں کرتی تھیں۔

میں یہ سب دیکھتا تھا اور عالیہ کے بارے میں بہت کچھ سوچتا تھا۔

اور پھر..... ایک روز میں آفس میں بیٹھا نئے کیس کی فائل دیکھ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی چیخ پڑی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ فون پر عالیہ تھی۔

''عقیل صاحب! باجی کا انتقال ہو گیا ہے۔'' اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

اور میں اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ میں نے اعلیٰ پیمانے پر ان کا علاج کرا کرا کر اگرچہ تاوان کا ایک بڑا حصہ ان کے نام کر چھوڑا تھا مگر وہ تاوان کی حدود سے شاید گزر چکی تھیں۔

جن دنوں انوری بیگم کا انتقال ہوا میرے چاروں بچے کالجوں میں پہنچ چکے تھے۔

عالیہ تمام رسومات میں اس طرح مصروف رہیں جیسے انوری بیگم ان کی حقیقی بہن ہوں۔

میں نے کبھی انھیں ایک دوسرے سے کوئی دُکھ کہتے نہیں سُنا تھا مگر شاید یہ عورتیں ادراک کے پنکھ پر بیٹھ کر سفر کرتی تھیں۔ دنیا میں شوہروں کو اپنی بیویوں سے بہت سی شکایتیں ہو جاتی ہیں۔

مگر مجھے عالیہ کی کوئی بات ایسی یاد نہیں جو قابلِ گرفت ہو..... عالیہ نے اپنی اچھائیوں سے روز بروز میرے ضمیر کا پھندا تنگ کیا ہے۔ ان کا ہر مرتبہ کا کوئی ایثار میرے قدموں تلے سے تختہ سرکا دیتا ہے اور میں دل پر ہاتھ رکھ کر پہروں سوچتا رہتا ہوں۔

اور جیسے کہ آج ہوا..... روحینہ سے میری دو بیٹیاں ہیں روحینہ اور رُشنی اور عالیہ سے میرا پہلا بیٹا اور اس سے چھوٹی تابندہ ہے۔

عالیہ کے رشتے داروں میں سے آج تابندہ کا رشتہ آیا تھا۔ عالیہ کو وہ لڑکا بے حد پسند تھا۔ اکثر ذکر کیا کرتی تھیں۔ مگر روحینہ ہتھے سے اُکھڑ گئیں۔

''عقیل صاحب! آپ تو باپ ہیں۔ آپ کے لیے تو روشی اور تابندہ برابر ہونا چاہئیں۔ روشی بڑی ہے۔ اس کا حق ہے..... کیا بدشکل یا لولی لنگڑی ہے میری بچی؟''

''روحینہ! رشتہ تابندہ کا آیا ہے۔ منگنی کر دیتے ہیں۔ شادی ابھی نہیں کریں گے۔'' میں نے سمجھایا۔

''ہوں..... اس طرح میری بچی کامپلیکس میں مبتلا نہ ہو جائے گی..... کہ.....'' وہ چڑ کر گویا ہوئیں۔

''عقیل صاحب! آپ کا وعدہ تھا آپ کبھی میری حق تلفی نہیں کریں گے۔ میرے بچوں کی حق تلفی بھی میری حق تلفی ہے۔''

''مگر یہ رشتہ عالیہ کے رشتہ داروں کی طرف سے آیا ہے۔'' میں نے انھیں سمجھایا۔

''اس ناتے وہ آپ کے بھی رشتہ دار ہیں۔ سب بچے آپ کے ہیں۔ ہم گرہ

میں باندھ کر نہیں لائے تھے۔ بول دی میں۔''

وہ کچھ سننے پر آمادہ نہیں تھیں۔

اور اس لمحے عالیہ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتی اندر چلی آئیں۔

''کوئی بات نہیں آپا! ٹھیک ہی تو ہے۔ روشی بڑی ہے آخر۔ ہماری بڑی بیٹی ہے۔ پہلے ہم اس کو بیاہیں گے یہ تو کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ بھائی میاں آئیں گے تو کہوں گی ان سے۔''

میں اور روحینہ خاموش بیٹھے رہ گئے۔

اور میں اپنی جگہ پتھر سا ہو گیا۔ عالیہ، بس کرو، بس کرو۔ اب تو پھندا شہ رگ کو چھونے لگا ہے۔ کتنی خوشی سے کل کہہ رہی تھیں۔

''میں بہت خوش ہوں۔ کتنے اچھے لوگ ہیں۔ تابندہ ماشاء اللہ بہت قسمت والی ہے۔'' اور اب کیا کہہ کر چلی گئی تھیں۔

میں روحینہ کے پاس سے اٹھ کر عالیہ کے کمرے میں آیا تو وہ تابندہ کے شانے پر ہاتھ رکھے اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اور میں بہت کچھ جان گیا۔ صرف عالیہ کی خوشی نہیں تھی بلکہ شاید میری پریوں جیسی بیٹی بھی.....

اور میرا جی چاہا آج سب سے لڑ کر عالیہ کو صرف اور صرف ایک خوشی دے ہی ڈالوں۔ مگر میں جانتا تھا وہ کبھی ایسا نہیں ہونے دیں گی۔

اس عورت کو شاید یہ نہیں معلوم اس کے ایثار..... خاموشی..... اور امن پسندی کے ہاتھ دن رات میری آگہی، میرے ضمیر کے گلے پر رہتے ہیں۔

جب بھی میں اندر کے طوفانوں سے گھبرا کر عالیہ سے اپنی زیادتیوں پر پشیماں ہوتا ہوں تو وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیر کر مسکرا اٹھتی ہیں۔ بڑی محبت سے کہتی ہیں۔

''خدا نہ کرے آپ مجرم ہوں۔ گنہگار ہوں۔ ہو جاتی ہیں بعض اوقات غلطیاں۔ اللہ بڑا معاف کرنے والا ہے اور میں اپنی چہیتی بیوی کو دیکھ کر رہ جاتا ہوں۔ ظالم..... طعنے بھی تو نہیں دیتی..... بُرا بھلا بھی تو نہیں کہتی۔

انوری بیگم تم خاموشی کے انگاروں کو میرا زادِ راہ بنا گئی ہو اور عالیہ.....

یہ مجھے علی بابا کی مرجینا نظر آتی ہیں جو میرے اعمال بلکہ سیاہ اعمال کے چالیس چوروں کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کرتی ہیں...... اور میرے اعمال کے چور چالیس نہیں ہیں۔ وہ چالیس کو معافی کے خنجر سے فنا کرتی ہیں تو ان سے کہیں زیادہ ''سیاہ اعمال'' سرکش اور جان بچا کر بھاگنے والے چوروں کی طرح میرے وجود میں لُوٹ مار مچانے لگتے ہیں۔

اور اس سے میں کس قدر نڈھال ہو جاتا ہوں۔

کوئی دیکھے میرے تڑپنے کا منظر...... جیسے مجھ پر سکرات کا لمحہ آن پہنچا ہو۔

اور جب یہ اندر کی لُوٹ مار مجھے پاگل کر دیتی ہے تب میں دیوانہ وار عالیہ کے کمرے کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہوں۔ نئی زندگی پانے کے لیے...... اس کمرے میں، صرف اس کمرے میں مجھے زندگی ملتی ہے۔ وہ میرا وجود پھولوں کی طرح سمیٹتی ہیں۔ میرا ضمیر جیسے ان کا سب سے چھوٹا لاڈلا بچہ ہے۔ وہ اسے محبت سے آنکھیں دکھاتی ہیں۔ گویا کہتی ہوں کیوں ستاتے ہو۔

اور مجھے ایسا لگتا ہے وہ ان کی بات مان جاتا ہے۔ میں گویا موت کے منہ سے واپس آ جاتا ہوں۔ موت اور زندگی کا کھیل جاری ہے...... کاش عالیہ مجھے طعنے دیا کریں حق تلفی پر چیخ چیخ کر رُو دیا کریں۔ آخر یہ مرجینا کب تک تنہا میرے سیاہ اعمال کے چوروں کا سدِباب کرتی رہے گی۔ کب تک......؟

روگی

اور کچھ یوں ہے کہ اب بھی حوصلہ جینے کا ہے
میں نے روشن کر لیا سینے میں دل بجھتا ہوا

''ہائے اللہ...... اُف!'' وہ کشن قالین پر سے اٹھاتے ہوئے کراہی۔

''یا الٰہی بچے ہیں کہ......، اس نے سیٹی کھینچتے ہوئے جھلا کر سوچا۔

ڈرائنگ روم، جنگ سے تباہ حال علاقے کا منظر پیش کر رہا تھا۔

کوئی تو صفائی پسند ہوتے ہیں اور کوئی ''صفائی کے جنونی'' وہ دوسری قسم سے تعلق رکھتی تھی اس لیے جھلاہٹ سوار تھی۔ فردوس پھپّو کو انگلستان سے آئے ہوئے آج چوتھا روز تھا، ان چار روز میں وہ ان کے ''خود اعتماد'' بچوں کے ہاتھ مداری کی بندریا بنی ہوئی تھی جن کی حاضر جوابی، شوخ و شنگ مزاج اور اٹھا پٹخ کو ان کی ذہنی گروتھ کا لازمی جزو جان کر ماں ان حرکتوں پر داد و تحسین کے ڈونگرے برساتی تھیں۔ پھپّو کی دیورانی اور ان کی سہیلی بھی پھپّو کے ہمراہ تھیں۔ ان کے بچے بھی ہمراہ تھے البتہ سہیلی کے بچے بلکہ بچیاں جوان تھیں۔ پھپّو اور ان کی دیورانی اپنے بڑے بچے گھروں میں چھوڑ کر آئی تھیں۔

ان کی آؤ بھگت میں وہ پیش پیش تھی۔ اس کے علاوہ سیر سپاٹے کے لیے لے جانا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا...... کیونکہ بڑے بھیا کو اپنے آفس سے فرصت نہ تھی۔ چھوٹے بھائی جان رسالپور میں تھے۔ فرح چھوٹی تھی۔

ڈولی اور کیٹی...... دونوں اسے رُوبوٹ کی طرح کام کرتا دیکھتیں اور حیران ہوتیں...... نوکروں سے کام لیتی گھر کی صفائی کراتی، آتی جاتی ماں سے مشغول کرتی، ان کے آرام کا خیال کرتی، ان سے خوش گپیاں کرتی اور تو اور وہ اسے اس وقت حیرانی سے گھورا کرتیں جب وہ انھیں سیر کے لیے لے جاتی۔ پھولے پھولے سرخ رخساروں پر مسکراہٹ

سے گڑھے پڑ جاتے، دوپٹا کانوں کے پیچھے اُڑ سے جب کسی مشاق ڈرائیور کی طرح گاڑی چلاتی۔ اپنے آپ سے بے پروا مخلص سی لڑکی انھیں بہت بھائی تھی۔ آج بھی وہ انھیں چائنیز ریسٹورنٹ لائی تھی۔ پھپھو ہمراہ نہیں تھیں، باقی سب تھے۔

ارے، یہاں کی بسیں کیسی ہیں جیسے ردّی لوہے کی چادروں سے کام لیا گیا ہو۔'' کیٹی نے انگریزی میں سب سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔ ''لوگ کتنے آرام سے بیٹھے ہیں جیسے بوئنگ سات سو سینتالیس کے وی آئی پی.....'' پھپھو کے چودہ سالہ ارسلان سمیت سب کے بلند و بانگ قہقہے گاڑی کی چھت پھاڑنے لگے۔

''ارے سعدیہ! یہ اتنی گاڑیاں جو سڑک پر دوڑ رہی ہیں، ان گاڑی والوں کے گھر کہاں ہوتے ہیں یہاں تو ہر طرف چار چار بلاک کے کابک نظر آ رہے ہیں۔''

سعدیہ نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر موڑ کاٹا۔

''ارے سعدیہ! یہاں تو کچھ بھی نہیں رکھا۔ سچ ہمارے ساتھ چلو، تب تمھیں معلوم ہوگا کہ زندگی کیا ہے، کیوں ڈولی.....؟'' کیٹی نے بہن کی تائید چاہی۔

''ہوں اور کیا۔'' ڈولی نے گویا تائید کر دی۔

''شکریہ فرینڈز! ہماری زندگی تو یہی ہے..... یہ پیارا وطن ہے۔ ہمارا..... ہمیں اچھا لگتا ہے۔''

''کیا اچھا لگتا ہے؟'' ڈولی نے اپنی دانست میں ٹھٹھول کیا۔

''مٹی.....'' اس نے گیئر بدلا۔

''مٹی؟؟ ہاہا..... ہاہا.....''

''معاف کرنا..... ڈولی..... پلیز، آئندہ میرے سامنے اس قسم کی گفتگو نہ کرنا۔'' اس نے کھولتے لہو کو دبا کر رسانیت سے کہا۔ ''اگر کوئی ماں کو گالی دے تو اولاد کبھی برداشت نہیں کر سکتی..... پھر میں کیسے برداشت کر سکتی ہوں۔''

ڈولی اور کیٹی اسے حیران نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

اس نے ونڈ اسکرین پر آنکھیں جما کر کہا۔

''نہ غربت تحقیر کے لیے پیدا کی گئی ہے، نہ امارت ستائش کے لیے..... ہر کوئی اپنے اپنے ٹھکانے، ماحول سے مانوس ہو جاتا ہے۔ ہم غریب ہی ٹھیک ہیں محنت کر رہے

ہیں، کبھی ہماری بھی صبح ہوگی۔''

وہ کس قدر سنجیدہ ہو گئی تھی..... دونوں لڑکیاں بلکہ ماں تک خفیف سی ہو کر رہ گئی تھیں..... وہ تو سمجھ رہی تھیں کہ یہ شاندار امپالا ڈرائیو کرنے والی یقیناً دیارِ غیر کے خواب دیکھ رہی ہوگی اور انھیں اپنی اپنی شان و عظمت کے گیت گنگنانے کا بہتر موقع مل گیا ہے۔ یہ بھی انسان کی فطرت ہے کہ دوسروں کو خود سے کمتر جان کر نہ جانے اپنے کس جذبے کی تسکین کرتا ہے..... مگر اس پُراعتماد، وطن پرست لڑکی سے منہ کی کھا کر رہ گئی تھیں۔ ادھر اس کا موڈ سخت آف ہو گیا تھا۔

''نہ جانے لوگ یہاں آ کر مہمان بن کر جی کو جلانے کیوں آ جاتے ہیں۔ اس طرح بڑھ بڑھ کر بولیں گے جیسے تاجِ برطانیہ کی وراثت میں کسی نمبر پر لگے ہوں۔''

اُونہہ..... وہ تو وطن کے معاملے میں نہایت حساس تھی۔ قومی تقریبات میں وہ محبتوں کے ڈونگرے برسا کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتی تھی کہ جج اس جوشیلی بھڑاس پر اُسے تمغوں سے نواز دیا کرتے تھے۔

وہ سوچتی تھی..... وطن سے متعلق وہ جس قدر حساس ہے شاید کوئی اور نہ ہو۔

اور یہ پاکستانی نژاد برطانوی، امریکی شہری جب یہاں آتے ہیں تو انتہائی کم ظرفی سے اسی مملکت کے خلاف زہر اگلنے لگتے ہیں..... مارِ آستین۔

''سوری ڈیئر، تم نے مائنڈ کیا۔'' کیٹی نے نچلا ہونٹ کاٹتی سعدیہ کو معذرت طلب نظروں سے دیکھا۔

اور وہ گاڑی پارک کرتے ہوئے دلکشی سے مسکرا دی، جیسے کہہ رہی ہو، ارے نہیں بڑے کشادہ دل ہیں ہم..... تمھاری ذرا سی ''سوری'' آگ اُگلتی دھرتی پر ساون کا پہلا چھینٹا ثابت ہوئی ہے۔

''مگر سعدیہ..... اے بھئی تم کوئی سیاست داں تو نہیں ہو جو اتنا سنبھل کر بول رہی ہو کہ پریس کا ڈر لگتا ہے..... بھئی جو دل میں ہے کہہ دو'' وہ کھسیانی ہنسیں۔

''ارے آنٹی، ہم ایک بار کہتے ہیں اور دل کی کہتے ہیں۔'' وہ مروّت سے مسکرائی..... اور اس روز کے بعد واقعی اس قسم کی گفتگو نہیں ہوئی۔

تمام گھر والوں نے حق مہمان نوازی خوب ادا کیا۔ آخر کار یہ سب تین ہفتوں

بعد کراچی آ گئے۔ گھر میں ایک دم ایسا محسوس ہوا جیسے کہ ابھی ابھی سفید جھنڈا لہرایا گیا ہو۔

ابھی ان مہمان نوازیوں سے فارغ ہو کر بیٹھی تھی کہ اس کا بی۔ ایس۔ سی کا رزلٹ آؤٹ ہو گیا۔ آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہنے لگا۔ امی کی ملنسار طبیعت کے باعث ان کی دوست بھی بے حد وحساب تھیں، انہی آنے جانے والے لوگوں میں اپنا کام دکھانے والے بھی آ گئے۔

گھر میں کھچڑی سی پکنے لگی۔

''نہیں۔''

''نہیں وہ۔''

''مگر نہیں..... وہی ٹھیک ہے۔''

والدین نے تمام کام کر کے خانہ پوری کے لیے چھوٹی چچی کو اس کے پاس بھیجا کہ ''بول تیری رضا کیا ہے؟''

اور چھوٹی چچی بہترین سفارت کار کے فرائض نبھانے لگیں۔

''بہت خوبصورت ہے، تعلیم یافتہ ہے۔''

''بڑا چھوٹا کنبہ ہے..... چھوٹے بچے نہیں، اگر ہوئے بھی تو بس تیرے ہی ہوں گے۔'' وہ شرارت سے ہنسیں۔ وہ اس سے دو تین سال بڑی تھیں، اس لیے سہیلیوں کی طرح تھیں ''اور اپنے بھائی صاحب اور بھائی جان کو تو بہت پسند آئے ہیں وہ لوگ۔'' وہ مزید بولیں۔ پھر مٹھی کھول کر سامنے کی۔ ''دیکھ..... یہ رہا..... میرے ہاتھ پر۔'' وہ کھلکھلائیں۔

وہ ان کی طرف خاموشی سے دیکھتی رہی۔

''ارے کیا منہ سی لیا ہے؟ مجھے جواب دینا ہے۔'' وہ بیزار ہو کر بولیں۔ ''اچھا چل میں پیٹھ کیے لیتی ہوں۔ خوب غور سے دیکھ لے۔

مگر وہ اسی زاویے سے بیٹھی رہی۔ وہ سلجھے ہوئے والدین کی بیٹی تھی۔

''بھئی، مجھے نہیں پتا چھوٹی چچی۔''

''کیا نہیں پتا؟''

''بھئی، آپ سب لوگ بہتر جانتے ہیں۔''

''سعدیہ، دیکھ تو لے، کتنا شاندار ہے۔'' انھوں نے تصویر اس کی ناک سے لگا دی۔

وہ بُری طرح جھینپ گئی۔

''اچھا چل، میرے جانے کے بعد دیکھ لینا۔'' وہ ساری کا پلو بدن پر چپکاتی ہوئی پھرتی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

پھر جھک کر اس کا منہ چومتی ہوئی جانے کان میں کیا کہہ گئیں کہ وہ شرم سے کٹ کر رہ گئی۔

گھر میں ہنگامے اتر آئے تھے..... یہ مشرقی شادی بیاہ کے ہنگامے الامان والحفیظ۔

اور جب اس نے دیکھا..... کہ واقعی وہ ایسا ہی ہے جیسا بتایا گیا۔

خوبصورت..... تعلیم یافتہ..... سنجیدہ پُروقار..... کم گو.....

سب کچھ تھا..... من پسند تھا..... مگر وہ اس وقت دھک سے رہ گئی جب سُنا کہ وہ تو اسٹیٹ میں رہتا ہے۔

آج سے نہیں عرصہ پانچ برس سے۔

''کیا مجھے بھی چلنا ہوگا؟'' اس نے احمقانہ سوال کر ڈالا۔ مگر اب تو کر دیا تھا۔ کم گو آدمی کا تو ویسے ہی رعب ہوتا ہے..... وہ سوال کر کے خود ہی خفیف سی ہو کر رہ گئی تھی۔ تب اس نے سیف سے کاغذات نکالتے ہوئے ایک نگاہ بیوی پر ڈالی۔

''اگر یہاں یہ در و دیوار میری کمی پوری کر سکتے ہیں تو تم رہو شوق سے۔''

وہ اس کے سادہ لہجے پر سہم سی جاتی تھی۔

''نہیں، میرا مطلب ہے کہ پاسپورٹ وغیرہ۔'' وہ گڑبڑائی۔

''کیا دیر لگتی ہے..... مگر بہرحال تم میرے جانے کے بعد تقریباً دو ماہ بعد ہی آ سکو گی۔'' وہ بریف کیس میں کاغذات رکھ کر کھٹاک سے بریف کیس بند کرتے ہوئے گویا ہوا۔ پھر ٹٹولتی ہوئی نظروں سے بولا۔ ''کیا تمہارا دل نہیں چاہتا جانے کو؟''

''ارے نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں..... جہاں آپ ہیں۔ مجھے تو وہیں رہنا ہے۔'' اس نے بڑی دیر بعد عقل مندی کی بات کی۔

''ہاں..... اور دیکھنے کی چیزیں بھی وہیں ہیں..... یہاں کیا رکھا ہے؟'' وہ اخبار اٹھا کر بیڈ کی طرف آتا ہوا بولا۔

اور وہ پھر جھلس کر رہ گئی۔

کیا رکھا ہے.....؟

کیا رکھا ہے.....؟

پھر وہی دھرتی ماں کی شان میں گستاخی۔ اس کی غربت پر ٹھٹھول۔

نہیں خیر، دیکھنے کو تو یہاں بھی بہت کچھ ہے..... اب اتنا بھی چھوٹا نہیں ہے یہ ملک۔'' اس نے خود پر قابو پا کر بیڈ پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

ان باتوں سے اس کے احساس میں آگ بھر جاتی تھی۔ ساتھی بھی ملا تو انہی لوگوں جیسا پرائے گن گانے والا وہ کمرے سے نکل کر ساس کے پاس چلی آئی۔

اور جب وہ فہد کے ہمراہ ذرا دیر کو گھر آئی۔ ذرا دیر سے مراد یہ کہ وہ کبھی اسے ایک رات کے لیے میکے نہیں چھوڑتا تھا۔ اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی۔ کبھی گھر کا کوئی فرد خاص طور پر امی اسے ٹھہرانے کے لیے اصرار کرتیں تب وہ اس کے تاثر سے عاری چہرے کی سمت دیکھ کر کہہ دیتی تھی۔

''پھر کبھی امی..... آج بھی گھر کا بہت کام چھوڑ کر آئی ہوں، انشاء اللہ چند روز بعد کافی دن کے لیے رہنے آؤں گی۔''

امی جانتی تھیں کہ اب ان کی سعادت مند بیٹی ایک شخص کی ذمے دار بیوی بن گئی ہے۔

تو..... آج وہ گھر آئی تو تنہائی میں چھوٹی چچی سے پیٹھ موڑ کر انگلیوں سے اشک پونچھتے ہوئے بولی۔

''آپ نے یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ فہد امریکا میں سٹیل ہے۔''

''تم نے تو تصویر تک دیکھنا گوارا نہیں کی تھی۔ تم سے اس کے متعلق کیا بات کرتی اور پھر یہ بات تو ایسی تھی جو گھر میں باتوں باتوں میں بھی معلوم ہو سکتی تھی اور یہ تم رو کیوں رہی ہو؟'' وہ اسے اپنی جانب موڑتے ہوئے بولیں۔

تب وہ سسک پڑی۔

''چھوٹی چچی، کتنی دُور پھینک دیا مجھے اٹھا کے۔''

''پگلی، تجھے ذرا خوشی نہیں، لڑکیاں تو امریکا کے خواب دیکھتی ہیں..... پاگل کہیں کی، ہم تو سمجھے تھے کہ تجھے پتا ہوگا..... اچھا چلو چپ ہو..... رُوتے نہیں۔''

''سیر و تفریح تک تو ٹھیک ہے..... اب نامعلوم عرصے تک کے لیے اتنی

دُور.....'' وہ پھر رو دی۔

''سعدیہ کیا بات ہے؟'' چھوٹی چچی نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ''فہد تو تمہارے ساتھ ٹھیک ہیں؟''

''ارے نہیں وہ تو بہت اچھے ہیں..... اتنی دُور..... اکیلے..... ڈر لگے گا مجھے۔''

''اچھا تیز موٹر چلاتے ہوئے تجھے ڈر نہیں لگتا..... اب تمہارا اپنا گھر ہے۔ تمہیں اپنا گھر بنانا ہے، سنبھالنا ہے۔ آج جن لوگوں کے لیے تم رُو رہی ہو، کل ان سے ملنے کی تمہیں فرصت نہ ہوگی۔ اب رُونا نہیں، بھابی جان تو ویسے ہی افسردہ ہیں۔ چلو اٹھو، شاباش موڈ ٹھیک کرو۔ رکو گی نا آج تو.....؟'' آج اس کا جی چاہا تھا کہ سچ بول ڈالے کسی سے تو۔

''دیکھ تو کتنی خوش قسمت ہے..... کتنی محبت کرتے ہیں فہد۔''

''جی۔'' اس نے اُبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ جیسے اس جملے میں کوئی کشش نہ تھی۔ ابھی میکے کی یاد بھولی تو نہ تھی، اس کا دل تو چاہتا تھا رہنے کو۔

آج فہد چلے گئے تھے، وہ تھکی تھکی سی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ جاتے جاتے وہ اسے کس طرح بے کل کر گئے تھے..... اتنی بے ساختگی تو ان چودہ دنوں میں نہ دیکھی تھی۔ شام کو ان کی فلائٹ تھی۔ وہ صبح سے اپنے کمرے میں بیڈ پر دراز رہے۔ گلابی یوک والی ڈھیلی شرٹ و شلوار میں وہ اداس اداس سے تھے وہ بھی مصروف تھی مگر فہد نے اسے کئی گھنٹے تک باہر نہ جانے دیا۔

ان کی مہک پورے کمرے میں رچی ہوئی تھی۔ اپنی انمول عمر میں آج اسے ایک نیا تجربہ ہوا تھا۔

تڑپنے کا.....

سسکنے کا.....

اور..... رت جگے کا۔

صرف پندرہ دن میں کوئی مرد عورت کی کائنات بدل سکتا ہے..... پھر اُسے یاد آیا، اس کی کائنات پندرہ گھنٹے میں ہی بدل گئی تھی۔

یوں بھی کوئی ہر دم اس کے گھٹنے سے تو نہیں لگا بیٹھا رہتا تھا، سر شام ہی ملتے تھے مگر نہ جانے یہ کیسے جذبے تھے، تن من کو خاکستر کر دینے والے۔

اس کے دو کنوارے دیور تھے، ایک نند تھی جو شادی شدہ تھی۔ سسر حیات نہیں تھے۔ بڑا مہذب سلجھا ہوا گھرانا تھا۔ جب اس نے اپنی ساس سے میکے جانے کے لیے اجازت طلب کی تو انھوں نے فوراً ہی دے دی بلکہ خود ہمراہ آئیں اور ایک روز ٹھہریں۔

دن ہوا سے گزر گئے۔

آج اس نے پاکستان سے شکاگو تک کا سفر تن تنہا کیا تھا۔

ضروری کارروائیوں سے فارغ ہو کر وہ ہراساں سی شکاگو ائیرپورٹ پر کھڑی تھی۔ اجنبی جگہ، اجنبی دیس، مشین کی طرح اپنے آپ میں گم گزرتے ہوئے اجنبی لوگ..... تیز بارش کے بعد ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ سیاہ اور مختلف خوبصورت چھتریاں تا حد نگاہ نظر آ رہی تھیں۔ فہد نظر نہ آیا تو وہ روہانسی سی ہوگئی۔ اس نے سوٹ کیس پر ایڈریس لکھی چٹ کو دیکھا..... خود اعتمادی میں دراڑ سی پڑ رہی تھی۔ اتنے اجنبی لوگوں کی بھیڑ میں اس کی ہمت نہ پڑی کہ کسی ٹیکسی کو روکتی، تب ہی ایک خوبصورت سی گاڑی سے فہد اترتا نظر آیا۔ سیاہ پینٹ، سیاہ ہی اوور کوٹ کے کالر کھڑے کیے ہوئے، دستانے چڑھائے، سیاہ گلاسز لگائے برا امریکی لگ رہا تھا۔ اسے اپنی سمت آتے دیکھ کر جان میں جان آئی۔ مگر وہ نروس سی ہوگئی۔

''ہیلو..... جان!'' اس نے اسے شانوں سے تھام لیا ''ارے، اتنی سخت سردی میں تم نے یہ سوئیٹر پہنا ہوا ہے۔''

مگر اسے تو گھبراہٹ میں سردی بھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ تب وہ اس کے شانے سے ٹک کر بولی۔

''مجھے اتنا ڈر لگ رہا تھا..... اتنی دیر لگا دی آپ نے۔''

''سوری..... یہ غلطی دانستہ نہیں ہوئی..... میں تو سمجھتا تھا، تم تعلیم یافتہ لڑکی ہو..... مگر بھئی تم تو اب تک وہی فرسودہ مزاج والی پاکستانی گرل ہو۔''

آتے ہی پہلا کچوکا لگا۔

''اس میں فرسودہ ذہنیت کا کیا سوال ہے۔ نئی جگہ ہے بالکل، جھجک تو ہوتی ہے پہلی مرتبہ۔'' یہ باتیں انھوں نے گاڑی تک آتے آتے کیں۔ سوٹ کیس فہد نے اٹھایا ہوا تھا اور بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی فہد نے اپنا کوٹ اتار کر اس کے کاندھے پر ڈال دیا.....

کوٹ کی گرمائی نے اسے احساس دلایا کہ وہ کتنی دیر سے سخت سردی کی اذیت برداشت کر رہی تھی کافی کشادہ فلیٹ تھا جو ہر آسائش سے پُر تھا، اسے آرائش پر کوئی خاص محنت نہ کرنا پڑی تھی۔ ان سے نیچے ایک انڈین فیملی تھی جن کے ساتھ وہ کبھی کبھار شاپنگ کے لیے چلی جاتی تھی۔ فہد کی ملازمت کے کچھ اوقات ہی نہ تھے۔ اچھا بھلا سوتے سوتے فون آ گیا اور وہ ڈیوٹی کے لیے تیار ہونے لگا۔

سخت بوریت کا عالم تھا۔ کھا پکا کر تیار ہو کر ٹی وی آن کر کے بیٹھ جاتی..... مگر جلد ہی اُکتا جاتی، کھڑکی میں کرسی رکھ کر رونق میلا دیکھنے لگتی..... مگر آنکھیں پتھرا جاتیں..... تب احساس ہوتا کہ ذہن تو کہیں اور ہے۔

تب کہیں جا کر اس کی صورت نظر آتی..... جو کہ روپیہ بنانے کی مشین نہیں فیکٹری بنا ہوا تھا۔ سارے انداز امریکیوں جیسے تھے مگر نخرے وہی پاکستانی شوہروں والے۔

''یہ پاکستان نہیں ہے، سمجھیں۔'' اس کے تنہائی کے شکوے پر وہ برس پڑتا۔ ''جہاں ہزار روپے کی نوکری کر کے باقی کام اُدھار ہوں..... یہاں ذرا ذرا سی ضرورت کے لیے اپنا پیسہ چاہیے سعدیہ بیگم۔''

وہ سہم جاتی..... دیس پرایا تھا..... ساتھی تو اپنا تھا، چاہے چار گھنٹے کے لیے سہی..... وہ چپ ہو جاتی..... ہزار ہمت باندھنے پر بھی نہ کہہ پاتی..... کہ اتنا تو پیسہ ہے..... مگر جب تنہائی کا جان لیوا احساس اس کی جان کو آتا اور وہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے مصداق شکوے شکایت پر منہ پھلا کر بتی بجھا کر سو جاتا..... اور وہ بھیگ میں ملے ہوئے چند گھنٹوں کی بے قدری پر باتھ روم میں جا کر گھٹ گھٹ کر روتی۔

رات گئے تک رُونے پیٹنے کی وجہ سے اس کی صبح آنکھ ہی نہ کھل پاتی۔

تب وہ صبح اس کے پاؤں کا انگوٹھا ہلا کر اٹھاتا۔ یہ اس کی خفگی کا واضح اظہار ہوتا..... تب وہ آنکھیں کھول کر جگانے والے کی سمت دیکھتی اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی..... کیونکہ وہ آفس جانے کے لیے بالکل تیار ہوتا بریف کیس اٹھائے۔

''دروازہ بند کر لو۔'' اسے جاگتا دیکھ کر وہ کہتا ہوا بیرونی دروازے کی سمت بڑھ جاتا۔

اور وہ ننگے پاؤں اس کے پیچھے چلی آتی..... ''وہ سنیں..... ناشتا.....''

''کر لیا ہے میں نے..... تیار کرنا آتا ہے مجھے۔''

اور وہ چہرے سے ملال ہٹا کر بناوٹی بشاشت چہرے پر لا کر اسے سی۔ یو کہتی.....
گویا باور کرانا چاہتی ہو کہ بھلا وہ کوئی ناراض تھوڑا ہی ہے بس یونہی آنکھ نہیں کھلی۔ مگر دروازہ بند کر کے اپنے آپ کو پیٹنے کو جی چاہتا۔

''کیا قیامت ہے..... خفا بھی نہیں ہو سکتے..... کھل کر رُو بھی نہیں سکتے۔ اسے اپنا آپ یکسر مظلوم دکھائی دیتا..... تب ناشتے کے بعد پاکستان فون کرنے کی تیاری کرنے لگتی۔

آج وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

''سعدیہ! طاہر اپنے گھر شادی کی خوشی میں پارٹی دے رہا ہے۔ شادی میں تو تم شریک نہیں تھیں۔ اس نے اور اس کی بیوی نے بہت اصرار کیا ہے کہ تم پارٹی میں ضرور شریک ہو۔''

ابھی گزشتہ ہفتے اس کے دوست طاہر نے ایک امریکی لڑکی ڈورتھی سیموئیل کو مسلمان کر کے شادی کی تھی مگر اس روز اس کی طبیعت خراب سی تھی اس لیے وہ تنہا ہی چلا گیا تھا۔

''کیوں چلو گی نا؟'' وہ جبر کبھی نہیں کرتا تھا۔

''جی ضرور۔''

''تو چلو آؤ، تمھیں کچھ جیولری دلا لائیں۔''

''میرے پاس کافی جیولری ہے۔''

''اب تم پاکستانی گنوار عورتوں کی طرح ست لڑے اور چمپا کلی پہن کر ان اسٹینڈر پارٹیز میں شرکت کرو گی؟'' اس کا موڈ ایک دم آف ہو گیا۔

اور اس کے منہ سے مشرقی زیورات کے نہایت جلے بھنے انداز میں نام لینے پر ہنسی تو بہت آئی مگر اس نے ضبط کر لیا۔

''میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا تھا، چلیں، میں تیار ہوتی ہوں، ابھی چلنا ہے ناں؟''

وہ مصالحانہ انداز میں بولی۔

اور وہ اسے ایک عالیشان زیورات کی دکان پر لے گیا، نہایت ماہرانہ انداز میں پتھروں کو پرکھ رہا تھا اور ساتھ ہی دعوت دے رہا تھا کہ وہ پسند کرے۔

تب اس نے ایک نہایت نازک سا سیٹ پسند کیا۔ جس میں سرخ نگوں کی بہتات تھی جو نگ نہیں یاقوت تھے۔

اس نے اس کی پسند کو سراہا..... اور جب وہ ادائیگی کر رہا تھا تب وہ چکرا کر رہ گئی، اس سیٹ کی مالیت لاکھ سے اوپر تھی مگر اس نے اس طرح ادائیگی کی جس طرح وہ آئس کریم خریدتی تھی۔

''ارے، یہ تو بہت مہنگا ہے۔'' اس نے میاں کے تاثرات جاننا چاہے اور اس کی سمت دیکھا بھی، کہیں وہ اس کی اتنی مہنگی پسند پر جھنجلا تو نہیں گیا۔

''زیورات تو ہوتے ہی مہنگے ہیں..... رہی پیسے کی بات تو سبھی کچھ تمہارا ہے۔''

وہ آج بہت خوشگوار موڈ میں تھا۔

اور وہ شرمندہ ہو کر سوچنے لگی۔

''ہر انسان کی اپنی اپنی عادت ہوتی ہے۔ میں ان کی سنجیدہ طبیعت پر خواہ مخواہ سوچنے لگ جاتی ہوں..... مرد تو عورت کو اپنی سانسوں کی مہک سے لوٹ لیتا ہے کجا یہ قاتل انداز باتیں۔ وہ مان گئی، ہلکی پھلکی ہو گئی۔

پھر وہ نہایت اہتمام سے تیار ہوئی بڑے دل سے بڑی چاہ سے۔

تقریب میں کافی پاکستانی، ہندوستانی جوڑے تھے۔ اس نے اپنے ڈھیر سارے انگریز دوستوں سے اس کا تعارف کرایا..... ایک سرخ داڑھی، سرخ بالوں والا انگریز بوڑھا فہد کا ہاتھ تھام کر ایک کونے میں لگی میز پر لے گیا..... فہد جاتے جاتے اسے اپنی چند انگریز ''سہیلیوں'' کے حوالے کر گیا۔ تقریب کے اختتام تک وہ بوڑھا اس کے ساتھ چپکا رہا۔

تین ماہ بعد وہ ایک ہفتے کے لیے وطن آئے۔

اپنے وطن کی سرزمین دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ایئرپورٹ کی عمارت پر نگاہ پڑتے ہی اسے ایسا لگا جیسے وہ ماں کی گرم آغوش میں آ گئی ہو۔

گو کہ انجانے لوگ تھے مگر شناسا لگ رہے تھے..... اپنے لگ رہے تھے..... اس کا دل چاہا فہد کو اپنا فیصلہ سنا دے کہ اب وہ مشینی ملک میں نہیں جائے گی۔ جہاں سرد مشینی لوگوں کا راج ہے۔

وہ اُجاڑ سُونا فلیٹ..... تنہائی..... اور یہاں کی راتیں بھی سہانی..... اس کی آنکھوں سے قطرے ٹپک گئے۔

فہد نے چونک کر دیکھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''میں..... میں..... بہت خوش ہوں۔'' اس نے سچ اُگل دیا۔

واٹ نان سنس کہتے ہوئے فہد نے بیلٹ کھولا اور بولا۔

''تم میرا بریف کیس اٹھا لو۔'' خود اس نے سوٹ کیس اٹھا لیے۔ ٹرالی شاید کوئی فارغ نہیں تھی اور وہ جلدی میں لگتا تھا۔ اس نے بریف کیس اٹھایا تو لڑکھڑا گئی، ایک سوٹ کیس جتنا وزن تھا۔ روانگی سے قبل اس نے گھر فون کر دیا تھا۔

ائیر پورٹ پر اس کی نند رخسانہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ موجود تھی۔

اپنوں کی مہک سے اس کے جذبات بھر بھر آ رہے تھے مگر وہ میاں کے خیال سے خود پر قابو رکھ رہی تھی۔

رخسانہ سے گلے مل کر آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے۔

''ارے بھابی آپ تو بالکل پری بن کر آئی ہیں۔'' وہ اس کے دودھیا ہاتھوں کو فرطِ شوق سے دبا کر بولی۔

بڑے چچا بھی کراچی میں مقیم تھے۔ وہ کسٹم میں ملازم تھے، سامان کی چیکنگ کے دوران ان سے ملاقات ہوگئی تھی۔ وہ اب عمارت کے باہر بھی ہمراہ تھے۔

دو دن رخسانہ کے ہاں قیام کے بعد وہ اسلام آباد چلے گئے۔ چار دن میں تو اس کی آنکھ سے ملن کے آنسو بھی خشک نہ ہوئے تھے کہ روانگی کا دن بھی آ گیا..... اسے اپنے عالیشان سجے سجائے فلیٹ کے خیال سے ہی جھرجھری آ گئی وہ شاید جان گیا تھا۔ تب ہی کہا۔

''تم رہنا چاہتی ہو تو رہ جاؤ، بعد میں آ جانا۔'' اس نے ہر تاثر سے عاری چہرے کی سمت دیکھا۔ اسے معلوم تھا اس کا مطلب کیا ہے۔

اس بار اس کے مزاج میں زیادہ سلجھاؤ پیدا ہو گیا تھا وہ نئے حوصلے سے چلی آئی۔ پھر اس نے تین چکر سال میں تنہا لگائے..... کہ وہ اس قدر فالتو نہیں کہ بھاگ بھاگ کر پاکستان جائے۔ اسے بیوی کے احساسات کی کیا خبر تھی جو دھرتی ماں کی آغوش کو ہی سب کچھ سمجھتی تھی یا قوت، ہیرے اور جواہرات سے زیادہ..... اور اب تو وہ عادی ہو گئی تھی۔

دوسری مرتبہ جب وہ تنہا جا رہی تھی، تب فہد نے اسے ایک ٹھوس سیاہ چھوٹا سا بکس دیا۔

''اسے حفاظت سے لے جانا۔ اس میں چند مائیکرو فلمیں ہیں ہمارے بزنس سے متعلق۔ کراچی ائیر پورٹ پر تمہارے چچا تو ہوں گے۔ اس کی حفاظت کرنا نہایت حساس چیز

ہوتی ہے۔ رخسانہ کے گھر عطا الرحمٰن نامی شخص جو ہماری کمپنی کا ڈائریکٹر ہے آئے گا، اس کے حوالے کر دینا اور یہ کاغذات ہیں، وہ ان پر سائن کرے گا ان کاغذات کی حفاظت اپنے زیورات سے زیادہ سمجھ کر کرنا۔'' وہ اسے اس طرح سمجھا رہا تھا جیسے وہ اسکول کی کام چور اُکتائی ہوئی بچی ہو۔

''انھیں اُچھالتی نہ پھرنا..... ذرا سی رگڑ سے یہ چیز خراب ہو جاتی ہے..... میں اپنا سوٹ کیس دے رہا ہوں جس میں یہ حفاظت سے رکھی جا سکتی ہیں۔ تم اپنا سامان بھی اس میں ہی ڈال لو۔''

اب تو اس کی گود میں سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والی بیٹی بھی آ گئی تھی۔ وہ اس میں مصروف ہوگئی تھی، اب تو اگر دو چار ماہ ہو جاتے تو وہ خود ہی کہتا تھا۔

''کیوں بھئی، کیا پاکستان جانے کا ارادہ نہیں ہے؟''

''لو خوش ہو جاؤ، تمہاری بکنگ کرا دیتا ہوں..... بولو کب جاؤ گی؟''

تب وہ خوش ہو کر تاریخ کا تعین کر دیتی۔

اور پھر وہ اسے سیاہ چھوٹا سا بکس بھی دیتا۔

''یہ آپ میرے ہاتھ ہی کیوں بھجواتے ہیں؟ اس کام کے لیے اتنا بڑا ادارہ کوئی دوسرا ملازم نہیں رکھ سکتا؟'' اس نے جھنجلا کر یا اُکتا کر یہ بات نہیں کی تھی۔ بس اپنی متجسس فطرت کے موجب چلتے چلتے سوال کر ڈالا تھا۔

تب اس نے دیکھا، میاں صاحب کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

''کیا ہاتھی جتنا وزن ہے؟ رہنے دو اگر تم سے یہ نہیں ہوتا۔''

''میرا مطلب یہ نہیں تھا۔'' وہ اس کی بات سنبھالتے ہوئے بولی۔

''یہ میرے مفاد کا کام ہے۔ اس کام میں مجھے سب سے زیادہ منافع ملتا ہے۔''

''کیا یہ آفس کا کام نہیں؟'' اس نے سوال کر دیا۔

''ہے تو آفس ہی کا..... مگر تم نے اوور ٹائم کا نام سُنا ہوگا تم..... اسے اوور ٹائم سمجھ لو۔ اور خدا کے لیے آئندہ میرا دماغ نہ کھانا۔'' یہ جملہ اس نے انگریزی میں کہا تھا۔ تب وہ خاموش ہو کر رہ گئی۔

.....✿.....

اس مرتبہ فہد کی ماں کے پُرزور اصرار پر کہ وہ عید یہیں کریں، وہ ہفتے بھر کے لیے چلے آئے تھے۔

اسی دم جمال بھائی کی شادی کا ہنگامہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے شوہر سے ایک ماہ رہنے کی اجازت طلب کی جو بلا تامل مل گئی۔ وہ تو اپنی چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے ہی روانہ ہو گیا تھا۔

اتنے عرصے کے بعد وہ خاندان کے ساتھ کوئی بڑی تقریب منا رہی تھی۔ بہت خوش تھی، ہر ہفتے میں دو مرتبہ فون کر لیتی تھی۔ جانتی تھی کہ وہ مشینی آدمی اسے کسی طور فون نہ کرے گا۔

اس نے دو خط بھی تحریر کیے تھے جن کی سعدیہ کو کوئی اطلاع نہ تھی آیا ملے کہ نہیں، جسے فون کرنے کی فرصت نہ تھی، وہ بھلا خط کیوں کر لکھتا۔ مگر اس مرتبہ حیران کن بات تھی کہ اس نے خود فون کر کے اس کی اور بیٹی کی خیریت دریافت کی تھی۔ وہ اس شخص کی عادی ہو چکی تھی۔ کوئی گلہ نہ تھا کوئی شکوہ نہ تھا اس سے۔

.....✿.....

اس نے تار بھیج کر اطلاع دے دی تھی کہ فلاں تاریخ کو آ رہی ہے۔ تار بھیجنے کی نوبت اس لیے آئی کہ تین چار فون کیے گھر بھی اور آفس بھی مگر اس کا ایک فون بھی ریسیو نہ کیا گیا۔ اس صورتِ حال سے وہ اور پریشان تھی۔

رومی سال بھر کی تھی، وہ اس کے انتظار میں تھی۔ رومی بھاگی پھر رہی تھی۔ وہ از حد ذہنی کوفت میں مبتلا ہو گئی تھی۔

''اونہہ یہ میں ہی تھی جو اس شخص کے ساتھ گزارہ کر لیا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتی تو دن میں تارے دکھا دیتی۔ کوئی پرواہ ہی نہیں ہماری، حد ہے کوئی..... آج کروں گی اچھی طرح کسائی..... بہت ہو لیا۔'' کافی دیر تک انتظار کے بعد وہ ٹیکسی کر کے گھر چلی آئی۔ فلیٹ کی دوسری چابی اس کے پاس تھی۔ فلیٹ میں داخل ہوتے ہی ایسا لگا جیسے وہ زلزلے سے تباہ حال بستی میں آ گھسی ہو۔

وارڈ روب سے کپڑے باہر لٹک رہے تھے۔ دونوں پٹ کھلے تھے۔ لاکر کی تمام درازیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔

کونا کونا اُلٹ پلٹ تھا۔ یہاں تک کہ باتھ روم کے شیشے تک اتار کر اوندھے منہ رکھے ہوئے تھے۔ رومی ذرا سی بچی تک حیران پریشان تھی، تب وہ سسک پڑی۔

''اتنی بے پروائی فہد! تمہاری ساری محنت آج چلی گئی۔ اُف میرا تو گھر لٹ گیا فہد.....''

فہد کے آفس فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک ماہ سے غیر حاضر ہے اور تین دن بعد اس کی ملازمت خود بخود ہی ختم ہو جائے گی۔

رُوتے رُوتے اسے خیال آیا کہ پولیس اسٹیشن فون کرے اس نے پولیس اسٹیشن فون کیا۔ اور نیچے انڈین فیملی رہتی تھی جس کے ساتھ اس کے دوستانہ مراسم تھے، وہ وہاں چلی گئی۔

''مم..... میرے فلیٹ میں چوری ہو گئی آنند بھائی۔'' وہ پھر رُو پڑی۔ ''میں نے پولیس اسٹیشن بھی فون کر دیا ہے..... پولیس آنے والی ہے۔ آپ میرے ساتھ اوپر چلیں۔''

''مسز فہد آپ کے گھر میں چوری نہیں ہوئی.....''

''آپ چل کر تو دیکھیں، واقعی چوری ہوئی ہے۔'' وہ آنند بھائی کی بات کاٹ کر بولی۔

میں کہہ رہا ہوں ناں..... آپ کے فلیٹ میں چوری نہیں ہوئی بلکہ تین ہفتے قبل آپ کے فلیٹ میں پولیس آئی تھی۔''

''پو..... لیس..... پولیس۔'' وہ تیورا کر گرنے لگی۔ آنند کی بیوی آشا نے اُسے تھاما۔ ''آپ کے شوہر پر قیمتی پتھر اسمگل کرنے کا الزام ہے۔ اس نے اتنا سُنا اور ہوش کھو کر آشا کی بانہوں میں جھول گئی۔

وہ چار گھنٹے بے ہوش رہی، اسی دوران پولیس بھی آئی تھی تب آنند نے پولیس کو بتایا کہ گزشتہ دنوں فلیٹ نمبر 32 کے باسی پاکستانی فہد عثمان کی گرفتاری عمل میں آئی تھی۔ ان کی بیوی اس بات سے لاعلم ہیں اور آج ہی پاکستان سے لوٹی ہیں۔ وہ سمجھیں کہ ان کے فلیٹ میں چوری ہوئی ہے۔ پولیس کی واپسی کے کافی وقت گزرنے کے بعد وہ ہوش میں آئی۔ دونوں میاں بیوی اور ان کی بڑی بیٹی اسے تسلی دینے لگے..... مگر اس کے آنسو نہ تھم رہے تھے۔ پرائے دیس میں تنہا لڑکی..... کوئی اپنا نہیں..... کیسا اندھیر تھا۔ آنند بھائی نے وعدہ کیا کہ وہ فہد کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔ تب وہ لٹی پٹی اپنے فلیٹ میں چلی آئی۔ رومی آشا بھابی کے پاس تھی..... وہ بکھری ہوئی چیزوں کے پاس بیٹھ کر خالی خالی

نگاہوں سے دیکھ رہی تھی چاروں طرف تم نے مجھے ذلیل ہی نہیں کیا فہد..... دیکھو..... وہ اجنبی دیس کے باسی اب میرے وطن کے لوگوں کے بارے میں کیا کہیں گے۔ وہ بھی پرائے ہیں جو تمھیں یہاں سے لے گئے ہیں۔ یہ بھی غیر ہیں جو میری دلجوئی کر رہے ہیں!

آنند اور آشا نے اس کی نہایت مخلصانہ مدد کی۔ انہی کی کوششوں کی بدولت آج وہ فہد کے سامنے کھڑی تھی۔

اس کا رواں رواں رو رہا تھا۔

''یہ آپ نے کیا کیا فہد.....؟'' وہ تڑپ کر رُو دی..... اس کا شیر کتنی بے بسی کی حالت میں تھا۔

''مجھ پر محض الزام ہے..... تم فکر نہ کرو..... سب ٹھیک ہو جائے گا..... بس ایک کام کرنا اس حادثے کی اطلاع پاکستان میں نہ دینا..... چند دنوں بعد سب ٹھیک ہو جائے گا..... تم فکر نہ کرو۔''

''لو بھلا، میں اپنی چادر آپ نوچ پھینکوں گی؟ اس نے رومی کو دوسرے شانے پر ٹکاتے ہوئے دکھ سے سوچا۔

''فہد..... کیا واقعی یہ آپ پر الزام جھوٹا ہے؟''

''ہاں۔''

''کب تک معاملہ ٹھیک ہو جائے گا؟''

''بہت جلد.....''

''انشاء اللہ۔'' اس نے منہ میں ہی کہا۔

مگر خدشات سے اس کا دل لرزنے لگا..... کیونکہ اس نے جیل میں سرخ بالوں، سرخ داڑھی والے بوڑھے انگریز کو بھی دیکھا تھا۔

اور بہت جلد فیصلہ ہو گیا۔ جرم ثابت ہو گیا تھا کہ پولیس تو شکاگو ائیر پورٹ سے فہد کے تعاقب میں لگ چکی تھی۔ ہر ثبوت نہایت واضح اور مدلل تھا..... جب اسے معلوم ہوا کہ فہد سات آٹھ برس اب آسمان کو ترسے گا تو وہ چکرا کر بے ہوش ہو گئی..... کہ وہ اس پرائے دیس میں کہاں تک وفاداری نباہے گی۔ صرف اپنے چند مفاد، اپنے چند فضول جذبوں کی خاطر، لوگ اس قدر گر جاتے ہیں کہ جو بے قصور ہوتے ہیں وہ ان سے زیادہ بامشقت سزا اٹھاتے ہیں۔

آج وہ بپھر کر اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی مگر اسے بے بسی سے سر ڈالے دیکھ

کر رواں رواں بین کرنے لگا رہی سہی کسر اس کی باتوں نے پوری کر دی۔

''سعدیہ درحقیقت تم ایک عظیم عورت ہو..... آج ہی نہیں میں تو کبھی بھی تمھارے قابل نہ تھا۔ تم پاکستان واپس چلی جاؤ..... اگر تم چاہو تو میں تمھیں آزاد کر دوں گا..... تم کسی ایسے شخص کا دامن تھام لینا..... جو تمھارے جیسے احساسات کا مالک ہو..... وطن دوست ہو۔''

''پلیز فہد، خاموش ہو جائیں۔'' وہ آنسو بہانے لگی۔ وطن یاد آیا تو کلیجے پر چوٹ لگی دیکھو تو بھلا سزا سے سزا تک کا سفر۔

''اب تو میری جان بخش دو..... اب تو میری جان پر رحم کرو، یہ عورت کا دل ہے فہد..... ایسا کتبہ جس پر رنگ پھیر کر نیا نام نہیں لکھا جاتا.....''

''میں..... انتظار کی مالا جپوں گی..... تنہائی..... کی بھٹی میں جلوں گی مگر تمہاری رہوں گی کہ میری سرشت میں تو ہے ہی وفاداری..... مگر آج میں تم سے چند وعدے لوں گی..... آج تمھیں میری بہت کچھ سننا پڑے گی۔ آج میرا وقت حاوی ہے میں اسے ضائع نہیں جانے دوں گی.....'' اس نے سلاخوں پر رکھے فہد کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

''فہد..... جب آپ یہاں سے نکلیں گے تو ہم اپنے وطن میں رہیں گے..... میں انتظار کروں گی۔ آپ نے اتنی بڑی بات کہہ کر میری شدید توہین کی ہے..... فہد میری مٹی میں فقط وفاداری ہے..... یہ آپ نے کیا کہہ دیا؟''

''فہد! لوگ..... مردہ ضمیر کا چٹانوں سا وزن اٹھا کر جی لیتے ہیں..... میں کیا انتظار کی خاک بھی نہ اٹھا سکوں گی۔'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی چوٹ کر گئی تھی۔

اُسے کبھی بے موقع بات کہنے کی عادت نہیں تھی، یہ بات اس نے موقع ہی سے کہی تھی..... فہد کا جھکا سر..... مزید جھک گیا۔

''آپ تو میری بیٹی کے باپ ہیں۔ مگر فہد! ایک بات ہے۔'' اس نے جیل کے چکنے فرش والے برآمدے میں سرخ فراک میں ملبوس سنہری بالوں والی (جن کو اس نے دو حصوں میں بانٹ کر پونیاں باندھی ہوئی تھیں) ڈیڑھ سال کی بیٹی کو اُچھلتے کودتے دیکھا۔'' آپ نے کبھی سوچا۔

کہ ستم آپ جیسے لوگ ڈھاتے ہیں.....

اور

روگ ماؤں کو لگ جاتے ہیں۔''

.....✿.....

شکستِ شب

حسن صد رنگ میں ایک سادہ سی تمنا بھی تو تھی
جائیے آپ سے تصویر بنائی نہ گئی

وہ بہت تیزی سے گیٹ میں داخل ہوئی تھی۔ ادھر ادھر دیکھنے بنا وہ تیزی سے بڑھی تھی۔

''تابندہ!'' بائیں پہلو سے آواز اُبھری اور اس کا دم سوکھ گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے گردن موڑی۔

''جی؟''

''ادھر آؤ بھئی! آج تصویر بنانے کا سخت موڈ ہے مگر کوئی تصور منظم ہی نہیں رہا۔ سنو۔ ایک دیہاتی لڑکی کی تصویر بنانی ہے جس کے سر پر گھڑا رکھا ہے۔ وہ کسی خاص تصور کے تحت مسکرا بھی رہی ہے۔''

''مم..... مگر..... میں..... وہ گھڑا.....''

''تم بھی دوسروں کی طرح بہانے بنا رہی ہو۔ گھڑا بھی آ جائے گا۔ خدا معلوم میرے وجود سے کون سی ایٹمی شعاعیں نکلتی ہیں۔ جو تم لوگ اس قدر ہچکچاتے ہو۔'' اس کے ماتھے پر سینکڑوں بل پڑ گئے۔

''وہ..... میں تو..... شالی کے پاس..... کک..... کا کام..... سے.....''

''تو میں کون سا تمھیں عمر بھر کو بٹھا رہا ہوں۔ ڈر کیوں رہی ہو اس قدر؟ کتے نے کاٹا تھا نا مجھے۔ چودہ انجکشن لگوانا بھول گیا تھا۔ کاٹ کھاؤں گا تمھیں؟'' وہ ہمیشہ کی طرح جنونی ہو کر اس پر اُلٹ پڑا اور وہ اس کی بے دام نہ ہوتے ہوئے بھی سہم کر نزدیک ہی بیٹھ گئی۔

''مم..... میں منع نہیں کر رہی ہوں۔ لیجیے بنا لیجیے۔''

''غفور! اندر سے گھڑا لے کر آؤ۔ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ جلدی، شاباش۔'' اس نے نوکر کو حکم دیا۔ وہ بری طرح ڈر گئی۔ خدا معلوم کب تک گھڑا اٹھانا پڑے گا۔

غفور ہانپتا کانپتا آن واحد میں خدا معلوم کس کونے کھدرے سے گھڑا اٹھا لایا۔

''لو اسے سر پر رکھو۔'' وہ نزدیک آ کر گھڑا اس کے سر پر رکھتا ہوا گویا ہوا۔

''وہ بے بسی کے عالم میں گھڑا سر پر سیٹ کرنے لگی۔''

''ہوں، ٹھیک ہے، شاباش، مسکراؤ۔'' وہ مسکرا دی۔ بڑی بے نیازی سی مسکراہٹ''

''ارے بھئی! ٹھیک سے مسکراؤ۔ قدرتی مسکراہٹ۔''

وہ تھوک نگلتے ہوئے بڑی بے بسی سے مسکرائی۔

اس نے بڑے غور سے اسے دیکھا اور کینوس پر اسکیچنگ کرنے لگا۔

گھڑا پکڑے پکڑے اس کے بازو شل ہو گئے۔

''اوں ہوں، ہلو نہیں۔'' وہ جھلایا۔

اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ ''بھلا اس کے اپنے تو اور میں کیوں اس کے رعب میں آ جاتی ہوں۔ میں نہیں پکڑتی اب گھڑا وڑا۔'' وہ باغی ہونے لگی۔

''کیا ہو رہا ہے تمھیں؟ سنتی نہیں ہو۔ ایک مرتبہ کی بات۔'' وہ اس کی صورت کا خاکہ بنا چکا تھا، گرج کر بولا تو وہ بری طرح سہم گئی۔

''نن۔ نہیں تو، وہ میرے بازو شل ہو رہے ہیں۔'' اس نے بالآخر کہہ دیا۔

''کیوں کھانا نہیں کھاتیں؟ ٹھیک سے بیٹھی رہو۔''

''ارے بھئی! بازو اس طرح رکھو۔'' وہ جھلا کر اس کے نزدیک چلا آیا۔ ''اے اس طرح سے۔'' اس نے اس کے بازوؤں کا زاویہ درست کیا۔ آنکھیں ٹھیک کرو، اوپر دیکھو۔''

اس نے پلکیں اٹھا دیں۔ ساتھ ہی ٹپ ٹپ دو آنسو اس کے رخساروں پر لڑھک آئے۔

''ہائیں! تم رو رہی ہو۔ کیا تمھیں زدوکوب کیا ہے میں نے؟'' مارے کوفت کے اس کا بھیجا الٹ گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ آنسو سلسلہ وار بہنے لگے۔

اس نے گھڑا جھپٹ کر گھاس پر دے مارا۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔

گھڑے کے ٹکڑوں پر ٹھوکر مارتا ہوا کینوس کی سمت بڑھا شیٹ اکھاڑ کر پرزے

پرزے کر دی۔ وہ لرز کر اندر جانے کے بجائے باہر کی سمت بھاگ گئی۔ ٹانگیں بری طرح لرز رہی تھیں۔

اس دن کے بعد اس نے پھر ادھر کا رخ نہیں کیا۔ شالی کئی مرتبہ آئی پوچھا بھی کہ وہ کیوں نہیں آ رہی۔ اس نے گول مول سا جواب دے دیا۔

مگر شالی سے چھوٹے سنی کی سالگرہ میں اس کو جانا ہی پڑا۔ امی نے جانے سے انکار کر دیا کہ بچوں کی محفل میں میرا کیا کام۔ وہ نیلے رنگ کے پلین سوٹ میں بڑی سادگی سے آئی تھی۔ شالی اور اس کی امی انتظامات میں لگی ہوئی تھیں۔ اس نے شالی کا ہاتھ بٹانے کا ارادہ کیا اور کچن میں آ کر چاٹ بنانے لگی۔

''چائے وائے بھی ملے گی آج یا روزہ رکھوایا ہے زبردستی۔ یہ وقت ہو گیا ہے۔ خود سے فرصت ملے تو کسی اور کا دھیان بھی رکھا جائے۔''

وہ ہمیشہ کی طرح بکتا جھکتا کچن میں آیا تھا۔ مارے گھبراہٹ کے چھری اس کے ہاتھ سے گر گئی۔

''اوہ! تم ہو، یہ شالی کہاں گئی؟ ایک گھنٹے سے چائے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ لگتا ہے سب کے کان پٹ ہو چکے ہیں۔'' تابندہ نے جھک کر چھری اٹھائی اور اس کی سمت دیکھے بنا بولی۔

''میں بنا دیتی ہوں چائے۔''

''ہاں! ذرا جلدی بنا دو۔ ابھی تو سالگرہ میں یہ حال ہے۔ اگلے ماہ وہ شالی سے ''بڑی'' کی شادی ہے جو لاہور میں سیر سپاٹے کرنے گئی ہیں۔ اس دوران تو شاید کھانا بھی ہوٹل جا کر کھانا پڑے گا۔'' حسب سابق اس کی زبان کی تلوار تیز چل رہی تھی۔

وہ چائے بنانے لگی تو وہ فوراً گویا ہوا۔

''ارے بس، بہت بہت شکریہ، میں خود بنا لوں گا۔ جو ہاتھ دُکھ گئے تو نسوے بہانے بیٹھ جاؤ گی۔'' وہ بے زاری سے کہہ کر الیکٹرک کیتلی اٹھانے لگا۔ وہ اس کے بدلتے انداز پر حیران رہ گئی اور ایک طرف ہو کر ابلے ہوئے آلو کاٹنے لگی۔

''خدا معلوم یہ چائے کی پتی کہاں رکھی ہے؟ سلیقہ نام کی تو کوئی چیز ہی نہیں اس گھر میں۔'' وہ عورتوں کے انداز میں صلواتیں سنانے لگا تھا۔ وہ خاموش کھڑی تھی۔

خدا خدا کر کے چائے بنی۔ وہ وہیں کھڑا ہو کر پینے لگا۔ اس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ ''خدایا! یہاں سے جاتا کیوں نہیں؟''

''ان لوگوں کے ہاتھ کوئی ادھار لے کر گیا ہے جو خاص طور پر تمھیں امپورٹ کیا ہے۔'' اس کا انداز مضحکہ خیز تھا۔

''نہیں خیر! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ یہ گھر بھی تو میرا ہے۔ نزدیکی پڑوسی ہیں، رشتے داروں سے بڑھ کر۔ کوئی غیریت نہیں ہے ہم میں۔'' وہ خود پر قابو پا کر آہستگی سے گویا ہوئی۔

''خوب۔'' وہ مسکرایا مگر انداز وہی کاٹ دار تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد سنی کیک کاٹنے لگا تو شالی نے ماں سے کہا۔

''امی! احسن بھائی کو بلا لاؤں؟''

''ارے چھوڑو، وہ یہاں بچوں میں آ کر کیا کرے گا؟'' وہ بے زاری سے بولیں۔

ماں کے کہنے پر وہ چپ ہو رہی مگر کیک کٹنے کے بعد ایک پلیٹ سجا کر اوپر چلی گئی مگر ایک دم اُوپر شور سا ہوا۔ شالی کی امی سعدیہ بیگم بدحواس ہو کر زینے کی طرف لپکیں۔ وہ بھی پیچھے ہو لی۔

اور پہنچ کر خوب نظارہ دیکھا۔ پلیٹ کرچی کرچی تھی۔ سارے لوازمات قالین پر بکھرے پڑے تھے۔ شالی دروازے پر کھڑی لرز رہی تھی۔

''ارے تم ہوش میں تو ہو؟ کیا کہا ہے تم نے میری بچی کو؟''

''میں نے کسی کو کچھ نہیں کہا۔ برائے مہربانی آپ لوگ یہاں سے تشریف لے جائیے۔''

''کیوں؟ تمھارے بابا کا استھان ہے۔ ارے ہر وقت میرے صبر کو آزماتا رہتا ہے یہ لڑکا۔''

''جی یہ بابا کا ہی استھان ہے۔'' وہ بڑے جذب سے پیٹھ موڑ کر بولا۔

''ارے خدایا! کیا قیامت ہے۔ نامراد گھر میں ذرا سی خوشی نہیں دیکھ سکتا۔ بغضی، حاسد، ایک اس نامراد کو ہر وقت پڑی رہتی ہے۔ احسن بھائی! احسن بھائی۔ ارے یہ بھائی نہیں ہے خون آشام بلا ہے۔ دانت گاڑ دے گا کسی دن حلق میں۔''

سعدیہ بیگم نے دو دھپ شالی کے رسید کیے اور روتی ہوئی زینہ اترنے لگیں۔ شالی

کو بھی ساتھ گھسیٹ کر لے گئی تھیں۔ وہ باہر ہی کھڑی تھی۔ وہیں کھڑے کھڑے سب کچھ سنا۔ اس نے اس قسم کے مظاہرے متعدد بار اس گھر میں دیکھے تھے۔ بچپن سے لے کر اب تک۔

یہ راز اس پر ابھی منکشف نہیں ہے کہ وہ
مرے بدن کی نہیں روح کی ضرورت ہے

اس دن شالی سے اسے ضروری نوٹس لینے تھے۔ وہ بڑی عجلت میں آئی تھی۔ سارا گھر سنسان پڑا تھا۔ وہ سیدھی شالی کے کمرے کی طرف آئی تھی، مگر وہاں کسی کو نہ پا کر پلٹی ہی تھی کہ ڈائننگ روم سے احسن نکلتا دکھائی دیا۔

''یہ شالی وغیرہ کدھر ہیں؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''وہ میرے نمک خوار نہیں ہیں جو مجھے بتا کر یا اجازت لے کر جائیں۔'' حسب عادت تلخ جواب ملا۔

''آتی ہوں گی۔ بیٹھ جاؤ۔ اوہ..... اچھا آؤ، تمھیں کچھ نئی تصاویر دکھاؤں۔'' اس کا موڈ پل میں بدل گیا۔ وہ اسی میں اپنی عافیت سمجھتے ہوئے اس کے پیچھے چلی آئی۔

''دیکھو، زیادہ تر خواتین ہی کی تصاویر ہیں۔ اس لیے تمھیں پسند آئیں گی۔''

''یہ دیکھو، یہ انتظار کی کیفیت ہے اور اس میں دیکھو نا اُمیدی کا تاثر۔ یہ دیکھو، ایفائے عہد کا منظر، بس اس نوجوان کی ذرا مونچھیں ٹھیک کرنا ہیں اور یہ دلہن ہے اس کے سر سے دوپٹہ ڈھلکا ہوا ہے مگر یہ دلہن ہے اور تم اس کے رخسار پر یہ داغ دیکھ رہی ہو؟ یہ تل ول نہیں ہے۔ سگریٹ سے جھلسا ہوا رخسار ہے یہ۔ تم کہو گی سگریٹ سے کیوں جھلسایا گیا ہے؟ تو عرض ہے کہ عین وقت پر آگ نزدیک تو ہوتی نہیں مگر سلگی ہوئی سگریٹ تو ہر جگہ میسر ہو سکتی ہے۔''

تابندہ کی کھوپڑی بھک سے اڑ گئی۔ اس نے بے طرح خوف زدہ ہو کر احسن کی سمت دیکھا۔ گرے شلوار سوٹ میں بظاہر باوقار نظر آنے والا وحشی۔

''آپ..... آ.....'' وہ ہکلانے لگی۔

''ارے بھئی، ڈرو نہیں۔ یہ تو تصویر ہے۔ مصور کا خیال ہے محض۔''

''احسن بھائی۔''

''فرمایئے۔''

''مجھے جانے دیجیے، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔'' وہ مرنے کو ہو گئی تھی۔

''ارے بھئی، میں نے کب تمھیں روکا ہے مگر تصویروں پر کچھ کمنٹس تو دیتی جاؤ۔''

''بہت اچھی ہیں۔'' وہ بمشکل بولی۔

''یہ جلے ہوئے رخسار والی، کہو ہے نا منفرد خیال؟''

''جج..... جی..... جی؟..... جی ہاں۔'' اس کا جی تو بہت چاہا کہ اس انفرادیت کی وضاحت مانگے مگر اس وقت جان پر بنی تھی، بری طرح ہکلا کر رہ گئی۔

''تابندہ!''

''جی؟'' اس نے نظریں اٹھائیں۔ وہ ہاتھ کی اوک میں سگریٹ لگانے لگا تھا۔ اس نے خوف زدہ انداز میں اسے دیکھا۔ اس نے بھی نظریں اٹھا دی تھیں۔ گھبرائے ہوئے سراپے پر چور نگاہ ڈال کر وہ بے ساختہ مسکرایا۔

''ڈرو مت، کیوں ڈرتی ہو اس قدر؟'' وہ آگے بڑھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''کمال ہے یار۔'' وہ ''کمال'' پر زور دے کر بولا۔ ''تم تو اس طرح ڈرتی ہو جیسے میں تمھیں سالم نگل جاؤں گا۔'' اس نے تصویر پر پردہ گراتے ہوئے بڑی انسانیت سے کہا۔

''تابندہ! لڑکیاں اگرچہ شیشہ ہوتی ہیں مگر انھیں جلایا جا سکتا ہے، توڑا نہیں جا سکتا۔ میں حیوان نہیں ہوں تابندہ! اور تم تو شیشے کا حسین بُت ہو۔ بہت خوبصورت معبد بنواؤں گا تمھارے لیے۔ مجھ سے کبھی نہ ڈرنا۔''

''احسن بھائی!'' وہ سارا ڈر بھول کر بگڑ اٹھی ''ہوش میں تو ہیں آپ؟''

''اگر تم سب اسی طرح شک و شبہ میں مبتلا رہے میرے متعلق تو ایک دن واقعی ہوش کھو بیٹھوں گا۔ اگر میں پاگل ہوں، دیوانہ ہوں تو زنجیروں میں باندھ کر مجھے گدو بندر کیوں نہیں چھوڑ آتے۔ حیدر آباد دور ہے یہاں سے؟''

وہ دوبارہ اپنے مخصوص رنگ پر آ گیا۔ وہ ایک دم باہر بھاگ لی۔ قدم رکھتی کہیں تھی پڑتے کہیں تھے۔ یوں گمان ہوتا تھا گویا پیچھے سے وہ ایک دم گردن دبوچ لے گا۔

.....✿.....

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

شالی سے بڑی منزہ عرف بلو لاہور سے آ چکی تھیں۔ گھر میں شادی کی زبردست

تیاریاں تھیں۔ بلو کا لاہور جانے کا پروگرام تھا، نہ ارادہ تھا۔ وہ تو نانی زبردستی لے گئی تھیں۔ مگر تابندہ تو اسی دن کے بعد وہاں جا کر نہ پھٹکی تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ احسن کا اس نے یہ رنگ پہلی مرتبہ دیکھا تھا کیونکہ وہ زرعی یونیورسٹی حیدر آباد میں تعلیم پانے کی وجہ سے وہیں ہاسٹل میں تھا۔ اس لیے کچھ فراموش سا کر دیا تھا اسے لیکن اس بار تو اس کی ایک ایک عادت جلا پا کر نکھری ہوئی تھی۔ بچپن اس کے ساتھ گزرا تھا۔ لڑکپن میں اسے برتا تھا مگر جانے کیوں وہ اس قدر خوف زدہ رہنے لگی تھی بچپن میں یہ بات بھی تھی کہ چچا چچی کا اس پر سخت کنٹرول تھا مگر اب تو وہ کسی کو گردانتا ہی نہ تھا۔ اس کے یہی ڈھنگ دیکھ کر تابندہ بے حد محتاط ہوگئی تھی۔ کتنے دنوں سے اس کے بلاوے آ رہے تھے مگر وہ نہیں گئی۔ کہ بس بارات والے روز چلی جائے گی۔ کہاں تو یہ شالی کے بغیر نوالہ حلق سے نیچے نہ اترتا تھا، کہاں اتنے اہم موقع پر منظر سے غائب تھی۔ دو دن تو بیماری کا بہانہ چل گیا مگر مہندی کی رسم کے روز تو امی بھی بگڑ گئیں کہ لڑکیاں آ کر روز پاؤں چھو رہی ہیں تم نخروں میں تل رہی ہو۔ وہ ناچار تیار ہو رہی تھی کہ سنی سے معلوم ہوا کہ احسن بھائی تو پرسوں فیصل آباد کسی کام سے جا چکے ہیں پھر تو گویا اس میں چابی بھر گئی۔ نہایت اہتمام سے تیار ہوتی گئی۔ خود پر لعنت بھیجتی گئی کہ اتنی خوبصورت گیدرنگ مس کی۔ کیا ضرورت تھی اس قدر خوف زدہ ہونے کی۔ کون سا اکیلا گھر تھا زمانے بھر کے تو مہمان بھرے ہوئے ہیں۔ شالی کے ہاں، اس نے خود کو نہایت اہتمام سے سنوارا۔ شالی نے کہہ دیا تھا کہ وہ دو دن ان کے ہاں ہی ہوگی۔ آج تو دلہا والے مہندی لے کر آ رہے ہیں، کل ہم لوگ جائیں گے۔ امی کو کیا اعتراض تھا۔ بخوشی اجازت دے دی۔

وہ ایک دم ہلکی پھلکی ہوگئی تھی اور شکر کر رہی تھی کہ وہ یہاں نہیں ہے۔ اس دن کے بعد تو واقعی اسے بہت ڈر لگنے لگا تھا مگر اب وہ بہت مسرور تھی۔ لڈی، خٹک میں حصہ لیا تھا۔ سہاگ کے گیت گائے تھے۔

اگلے روز دلہا کے ہاں جانے کی تیاری میں سارا دن بھگدڑ مچی رہی۔ مہندی کے تھال سجائے گئے، پھولوں کی ڈوریاں بنائی گئیں جنھیں لڑکیوں نے تھال اٹھاتے وقت انگلیوں میں لپیٹ کر زنجیر کا سلسلہ بنانا تھا۔

وہ لوگ رات دو بجے واپس ہوئی تھیں، وہاں سے آ کر پھر بجائے اس کے کچھ

آرام کرتیں ڈھولک لے کر بیٹھ گئیں۔

احسن کی غیر موجودگی میں اس کے کمرے میں بھی مہمانوں کا تصرف تھا۔ وہ سارا دن مصروف رہی تھی، اس لیے نیند لینے کے لیے کمرے میں چلی آئی۔ نیند سے بُرا حال تھا۔ بیڈ پر ایک دو خواتین دراز تھیں۔ کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ لان سے قمقموں کی روشنی براستہ دریچے اندر چھن چھن کر آ رہی تھی۔ وہ بیڈ گھرا دیکھ کر صوفے پر لیٹ گئی۔ آنکھوں موندتے ہی غافل ہوگئی۔

مگر اسے اٹھ جانا پڑا کیونکہ کوئی اسے جگا رہا تھا۔ وہ ایک دم بدحواس ہوگئی کیونکہ نیلے بلب کی مدھم روشنی میں اس کے سامنے احسن کھڑا تھا۔

اس نے بیڈ کی سمت دیکھا، کمبل سمٹا ہوا پائنتی پر پڑا تھا۔ چادر پرشکن تھی، تکیے بے ترتیب تھے۔ احسن الگ نیند کا مارا لگ رہا تھا۔ شب خوابی کے آسمانی ڈریس میں وہ خود بھی بے ترتیب سا لگ رہا تھا۔ (یقیناً کسی غلط فہمی کی بنا پر سو رہی ہے)

''تابندہ پلیز! وہاں جا کر سوؤ جہاں دوسری لڑکیاں ہیں۔ میں خود کہیں اور سو جاتا مگر ڈرائنگ روم تک خواتین سے فل ہے۔ اس لیے مجبوراً تمھیں اٹھانا پڑا۔ میں تو بے حد آرام سے سو رہا تھا۔ یونہی آنکھ کھلی تو دیکھا صوفے پر کوئی سو رہا ہے دیکھا تو تم تھیں۔ یہ تمھارے لیے بہتر نہیں ہے تابندہ۔ اس لیے پلیز کسی اور کمرے میں۔ خواہ مخواہ افسانے بن جاتے ہیں۔'' وہ بھاری آواز میں بولتا ہوا اپنے ماضی سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا۔

اور وہ تو بہت کچھ سوچ کر ہراساں ہوگئی۔ شرمندہ شرمندہ سی اٹھ کر باہر آ گئی۔

''خدایا! یہ کہاں سے آگ آئے، راتوں رات؟'' اس کی تو نیند ہی اڑ گئی تھی۔ یہ وحشی اتنی باریکی سے بھی سوچ سکتا ہے؟ وہ حیران تھی، مگر بہت شرمندہ بھی تھی۔

نگاہِ شوق سرِ بزم بے حجاب نہ ہو
وہ بے خبر ہی سہی اتنے بے خبر بھی نہیں

رات تو وہ ہوش میں نہیں تھی، نیند و تھکن کا غلبہ تھا مگر صبح اٹھنے کے بعد جب رات کا منظر اس کے ذہن نے دہرایا تو اسے عجیب طرح کی خجالت کا احساس ہوا لیکن یہ بھی ہوا کہ ساری زندگی میں پہلی مرتبہ اس کے لیے تابندہ کے دل میں اچھا سا تاثر پیدا ہوا۔ ساری

زندگی اس سے ڈرتی رہی تھی، صرف وہی نہیں بلو، شالی، سعدیہ بیگم اردگرد کے دوسرے پڑوسی بچے (سابقہ) کہ اب تو وہ سب ان ہی کے ہم عمر تھے۔ پہلے سے زیادہ گہری دوستیاں ہو چکی تھیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ احسن کے قریب آنے کے بجائے لوگ اس سے دور ہی ہوئے تھے۔ بہرحال رات اس نے بڑا گہرا تاثر تابندہ پر چھوڑا تھا۔

وہ شالی، سعدیہ بیگم کے ساتھ انتظامات میں مصروف تھی۔ ڈرائنگ روم میں ناشتے کے بعد پھر ڈھولک پر تھاپ پڑنا شروع ہوگئی تھی۔

''تابندہ! ایسا کرو، اتنا ابٹن پڑا ہوا ہے، نہانے سے پہلے بلو کے ایک مرتبہ اور لگوا دو۔ ابٹن بہت اچھا ہے۔ مراد آبادی ہے۔ پچھلی مرتبہ رشید (شالی کے والد) کی چچی ہندوستان سے لائی تھیں۔ میں نے بہت سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ شاید بلو اب رضا مند ہو تم ذرا اسے بہلا کر لگا ہی دو، خواہ مخواہ پھنک کر جائے گا۔'' وہ عجلت میں جلدی جلدی بتا کر نوکر کی طرف مڑ گئیں۔

ابھی ابٹن شروع ہی کیا تھا کہ لڑکیوں نے شرارت شروع کر دی۔ گولے بنا بنا کر نشانے باندھنے لگیں۔ اس کا مہندی کلر کے خوبصورت سوٹ کا ستیاناس ہوگیا۔ وہ اٹھ کر کپڑے بدلنے باہر آ گئی۔

ایک دو سوٹ اس نے ہمراہ رکھ لیے تھے۔ کاسنی رنگ کے پلین سوٹ اور پرنٹڈ دوپٹے میں بھی وہ ایک ہی نظر آ رہی تھی۔ وہ واپس ڈرائنگ روم میں آئی تو لڑکیاں اسی طرح شرارتوں اور گانوں میں مصروف تھیں۔ سوئچ بورڈ کے پاس الیکٹریشن کے ہمراہ احسن کھڑا ہوا تھا۔ تاروں کا گچھا اٹھائے ہوئے غالباً۔ باہر لائٹنگ کا انتظام درست کیا جا رہا تھا۔ آف وائٹ پینٹ اور سیاہ چیک کی شرٹ میں ہمیشہ کی طرح ویل ڈریسڈ نظر آ رہا تھا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو پھر دانتوں سے تار کاٹنے لگا۔ وہ اس قدر متاثر کن شخصیت رکھتا تھا کہ بہرحال سب اس کی موجودگی ڈرائنگ روم میں محسوس کر رہے تھے۔

شالی کی لاہور سے آئی ہوئی کزن بڑے پیارے پیارے ٹپے، ماہیے گا رہی تھیں۔ وہ ساتھ بیٹھ کر تالیاں بجانے لگی۔ وہ عین اس کے سامنے تھا۔ اب مڑ کر سوئچ بورڈ کھول رہا تھا۔ بعض لڑکیاں جو احسن سے واقف نہیں تھیں اسے دیکھ کر زیادہ ہی چہک رہی تھیں۔

چٹا کٹر بنیرے تے

کاسنی دوپٹے والیے منڈا عاشق تیرے تے

لڑکیاں ٹپہ گا رہی تھیں۔ (سفید مرغ منڈیر پر..... کاسنی دوپٹے والی لڑکا تجھ پر عاشق ہے)

لڑکیوں نے شرارت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ (گاتے گاتے) سب کی نظریں تابندہ پر ٹکیں۔ سچویشن کے عین مطابق وہ کاسنی کپڑوں میں تھی۔ لڑکیوں کے اس طرح ہنسنے پر ایک لمحے کو وہ بھی جھینپ گئی۔ گویا یہ ٹپہ اسی کے لیے تخلیق کیا گیا ہو۔ اسے ایک دم احساس ہوا کہ وہ کسی کی نگاہوں کی زد میں ہے۔ اس نے بے ساختہ نظریں اٹھائیں۔ تاروں کے سرے ملا کر بل دیتے ہوئے وہ مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ غالباً اس نے بھی لڑکیوں کی شرارت کا نوٹس لیا تھا۔ تابندہ نے سٹپٹا کر نگاہوں کو جھکا لیا۔ اس کا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ اس سے تالیاں بھی نہ بجائی گئیں۔ وہ ہنوز سوئچ بورڈ کے پاس تھا۔ ڈھولک کی تھاپ اونچی ہوگئی۔ لڑکیاں کبھی کبھی چور نظروں سے اس خود اعتماد نوجوان کو بھی دیکھ لیتی تھیں جو بہت مصروف تھا۔ شالی دل ہی دل میں حیران ہو رہی تھی کہ آج احسن بھائی گھر میں دلچسپی کیوں لے رہے ہیں، ورنہ ان کا تو یہ حال ہے کہ کوئی مرے یا جیے جانے ان کی بلا۔

بارات کی آمد سے قبل وہ بہت اہتمام سے تیار ہو چکی تھی۔ گھر سے امی وغیرہ بھی آ چکی تھیں۔ وہ بلو کے پاس بیٹھی شالی کی کلائی میں چوڑیاں ڈال رہی تھی کہ وہ دروازے پر دستک دے کر اندر چلا آیا۔

''کیا تم لوگوں نے مہمانوں کے ڈر سے چائے کی پتی کہیں چھپا کر رکھ دی ہے۔ ایک تو میں تم لوگوں سے کبھی اپنے کام کے لیے نہیں کہتا ہوں۔ خود کرنے لگتا ہوں تو چیزیں غائب۔ اب کیا چائے بھی خرید کر بیڈ روم میں رکھنا پڑے گی۔'' وہ بلا کاسے، فل اسٹاپ شالی پر برہم ہو رہا تھا۔

بلو نے ناگواری سے منہ بنایا۔ ''سب اتنے مصروف ہیں، عجیب افراتفری مچی ہے، انھیں بے وقت چائے کی سوجھی ہے۔ ابھی چار بجے تو سب چائے پی رہے تھے۔''

''چپ کریں اپیا! کہیں سن نہ لیں۔'' شالی نے بہن کو ٹھوکا مارا۔

''ہونہہ، سن لیں تو سن لیں۔ جان کے دشمن۔ رنگ میں بھنگ ڈالنا تو کوئی ان

سے سیکھے۔''

بلو کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ تب شالی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''وہیں تھی چائے تو، احسن بھائی! آپ مجھے کہہ دیتے۔'' شالی نے خیر سگالی کا انداز اپنایا۔

''تم لوگوں کو اپنے ہار سنگھار سے فرصت تو مل جائے۔'' اس نے پھر پتھر سا مارا۔

''دیکھا تم نے، اس شالی نے نواب صاحب کا مزاج اور خراب کر دیا ہے۔ خواہ مخواہ آگے پیچھے پھرتی ہے۔''

بلو تابندہ کی طرف متوجہ ہو کر گلہ آمیز انداز میں گویا ہوئی تھی۔ ''اتنا کہتی ہوں، سنی اَن سنی کر جایا کرو۔ ان سے تو وہی بات کرے جسے اپنی توہین کرانی ہو۔ اتنا تو کوئی سگا بھی نہ کرتا جتنا ہم نے ان کا کیا ہے۔ میں نے تو امی سے کئی بار کہا کہ انھیں تو بچپن سے ہی پاگل خانے بھیج دینا چاہیے تھا۔ کم از کم سکون تو ہوتا۔'' بلو کا لہجہ نفرت سے کڑوا ہو رہا تھا۔

''ارے نہیں، اگر پاگل ہوتے خدانخواستہ تو اتنی تعلیم کیسے حاصل کرتے؟'' تابندہ سے رہا نہ گیا۔

''تم نے سنا نہیں کہ اپنے مطلب کو تو دیوانہ بھی ہوشیار ہوتا ہے۔'' بلو نے اپنی نفرت کا نیا جواز پیش کیا۔ ''بعض اوقات تو صاف لگتا ہے کہ ڈھونگ ہیں، ہمیں زچ کرنے کے۔ تم نے بھی ٹھیک کہا، واقعی تعلیمی ریکارڈ تو ان کا ٹھیک رہا ہے، مگر تم یہ بھی تو دیکھو، کیا یہ انسانوں کے انداز ہیں؟ مجھے تو لگتا ہے کوئی روح حلول کر گئی تھی ان کے اندر۔'' بلو کی نفرت لا انتہا تھی۔ وہ تو تھی ہی خاموش طبع بلو کی زہریلی باتیں صبر سے سنتی رہی۔ اگرچہ اس کو بہت تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔

تم زمانے کی راہ سے آئے
ورنہ سیدھا تھا راستہ دل کا

سعدیہ بیگم شوہر کے انتظار میں ابھی تک جاگ رہی تھیں کہ دروازہ بجا۔

''کون ہے؟ آ جاؤ۔'' انھوں نے کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

وہ اندر آ گیا اور بغیر کچھ کہے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

انھوں نے ناگواری و تعجب کے ملے جلے احساسات کے تحت اسے دیکھا تھا کیونکہ وہ کبھی ان کے بیڈروم میں نہیں آیا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' انھوں نے سرد مہری سے پوچھا۔ ایسا رویہ جیسے وہ اپنے بے دام سے مخاطب ہوں۔ اٹھ کر بیٹھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی تھی بلکہ مستقل کتاب میں گم تھیں۔

''ایک بہت خاص بات کرنی ہے آپ سے۔'' اس نے ان کے رویے پر اپنی تلخی چھپا کر بڑے ضبط سے کہا۔

وہ اس طرح اٹھ کر بیٹھیں جیسے اس کی سات پشتوں پر احسان کیا ہو۔

''کہو۔'' انھوں نے اس کو بڑی تفصیل سے دیکھا۔

''میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے اپنے مخصوص نڈر انداز میں بڑے عام سے لہجے میں کہا۔

''کہاں کر رہے ہو؟'' انھوں نے رکھائی سے دریافت کیا۔

''آپ ہی لوگ کریں گے۔'' وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتا ہوا بولا۔

''کون دے گا تمھیں لڑکی؟ کم از کم میرے جاننے والے تو یہ سننا بھی گوارا نہیں کریں گے۔'' انھوں نے استہزائیہ انداز سے کہا۔

''کیوں؟ کیا ہاتھ پاؤں نہیں ہیں میرے یا نابینا ہوں؟ یا غریب اور جاہل ہوں اور نہ ہی بدشکل ہوں۔ حالانکہ سُنا ہے مرد کی شکل نہیں دیکھی جاتی۔''

''یہ ہی تو کہہ رہی ہوں صرف شکل ہی نہیں دیکھی جاتی اور تمھارے پاس سوائے شکل کے اور ہے ہی کیا؟'' انھوں نے نفرت سے اسے دیکھا۔ سیاہ شلوار قمیص میں اوپر کے دو بٹن کھولے آستینیں پلٹے مکمل مردانگی کا شاہکار نظر آ رہا تھا۔

''اس قدر غلط بیانی سے کام نہ لیں چچی جان! اور کیا ہونا چاہیے۔ شکل بھی ہے، پیسہ بھی ہے، باپ کمائی بھی ہے۔ میرا مطلب ہے جائیداد وغیرہ۔''

''سب کا پتا ہے۔'' وہ کترا کر گویا ہوئیں ''مگر پھر بھی کوئی اپنی لڑکی جانتے بوجھتے جہنم میں نہیں جھونکے گا۔''

''اگر یہ گھر جہنم ہے تو اس میں بھی آپ ہی کا حصہ ہے کہ گھر تو آپ ہی کا ہے۔''

''میں گھر کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ تمہاری حرکتوں، تمہاری عادتوں کی بات کر

رہی ہوں، تمھارے پاگل پن کے دورے کی بات کر رہی ہوں۔'' ان کی زبان تلوار سے تیز ہونے لگی۔

''بس کریں چچی جان! حد ہوتی ہے برداشت کی۔ یہ بھی آپ نے ہی اڑائی ہوگی کہ میرا دماغ خراب ہے۔'' اس نے جواباً نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

''لوگوں کے پاس آنکھیں ہیں۔ اللہ کی دی ہوئی عقل ہے۔''

''میں مزید کچھ سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میں تابندہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے بگڑ کر کہا۔

''لو بھلا کسی دور پرے رہنے والی لڑکی کا رشتہ مانگتے تو کوئی بات بھی تھی۔ تابندہ! ہونہہ دیوار سے دیوار ملی ہے۔ رشتے داروں سے چھپ سکتا ہے کچھ پڑوسی سے نہیں جب کہ ہمارا ان کا اتنا میل جول بھی ہے۔'' وہ بھڑک گئیں۔ ''خوب ذلیل کروانے کا سوچا ہے بخشو بابا۔ ان کی اکلوتی بیٹی، تعلیم یافتہ، خوبصورت، انھیں رشتوں کی کیا کمی؟''..... وہ بھنک کر بولیں۔ ''لوگ گھر اور شکل دیکھ کر بیٹیاں نہیں دیتے۔ عادتیں مزاج بھی دیکھے جاتے ہیں۔ تابندہ کا تو خیال بھی ذہن میں نہ لانا۔ ارے میرے آگے بھی بیٹیاں ہیں۔ میں کیوں کسی کی بچی پر ظلم کروں۔'' انھوں نے بڑے برہم انداز میں اسے گھور کر کہا۔

''محض آپ کی نفرت اور عداوت ہے۔ ورنہ میں خود کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ کیوں مجھے خوش دیکھنے لگیں۔ چچی جان کیا مجھے علم نہیں کہ عرفان بھائی کی شادی چار سال کے لیے کیوں ملتوی کر دی گئی ہے۔ اس لیے کہ لندن جیل سے ان کی رہائی ہی چار سال بعد ہوگی۔'' اس نے آگ لگا دینے والی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر گھورا۔

''شاید لوگوں کو یہ علم نہیں کہ بلو کی شادی پر آپ بار بار بے ہوش کیوں ہو رہی تھیں۔ صدمہ جو دُہرا تھا ایک بیٹی کی جدائی کا دوسرے بڑے بیٹے کی غیر موجودگی۔''

''اچھا تو تم اب اس نیچ پن پر اتر آئے ہو۔''

''نہیں چچی جان! میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ جب ایک سزا یافتہ نوجوان کو ساہوکار کی حسین بیٹی مل سکتی ہے، اصلیت چھپا کر ہی سہی تو پھر میں تو معاشرے میں معزز مقام رکھتا ہوں۔ مفرور نہیں ہوں۔ قاتل نہیں ہوں۔ اس کے باوجود، آپ تابندہ کے ہاں جائیں گی، ہر حال میں وہ میری ہوگی۔ وہ میری ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

''دیکھو میاں! اگر تم ہمیں اس لیے دبانے کی کوشش کرتے ہو کہ تمھارے باپ نے رشید کی مالی امداد کی تھی۔ انھیں کاروبار کرایا تھا تو اس احسان کا بدلہ ہم تمھیں اس گھر میں رکھ کر مسلسل ذہنی عذاب میں رہ کر اتار چکے ہیں، جہاں سینگ سمائیں چلے جاؤ۔ خدا کے واسطے اب ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔'' وہ رُونے لگیں۔

''میں چلا جاؤں گا چچی جان! مگر اس وقت جب تابندہ میری ہوگی۔ میں اسے ساتھ لے کر جاؤں گا۔''

''وہ لوگ نہیں مانیں گے۔'' سعدیہ بیگم نے آنسو پونچھے۔

''جب آپ اپنے مجرم بیٹے کے لیے ایک معزز گھرانے کی لڑکی باندھ رکھنے پر قادر ہیں تو؟''

''جب اصفیہ سے رشتہ ہوا تھا تو عرفان مجرم نہیں تھا۔'' وہ بدستور اڑی ہوئی تھیں۔

''جب وہ بات چھپ سکتی ہے تو دیکھیے اگر میری شادی تابندہ سے نہ ہوئی تو اصفیہ بھی کبھی اس گھر میں نہیں آئے گی۔''

''تم احمق! گستاخ نیم پاگل تو تھے ہی اب بلیک میلر۔'' وہ دانستہ رک گئیں۔

''خون جو ایک خاندان کا رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ بھائی کا اثر تو آ سکتا ہے ناں۔ اسمگلر نہ سہی بلیک میلر ہی سہی اور پھر یہ بلیک میلنگ تو نہیں اپنا فطری حق مانگ رہا ہوں۔ انصاف مانگ رہا ہوں۔ جب تک آپ کا اختیار تھا۔ خوب حق تلفی ہوئی مگر اب چھین لینے کی قدرت رکھتا ہوں۔''

''تو چھین لو۔ میری منتیں کیوں کر رہے ہو۔''

''یہ بھی کر سکتا ہوں مگر اس طرح بھی نقصان آپ ہی کا ہے۔'' وہ مذاق اڑانے کے انداز میں بولا۔

''کاش تمھاری ماں اتنی جلدی نہ مر گئی ہوتی۔ کم از کم تھوڑی بہت تمیز تو سکھا جاتی تمھیں۔'' وہ بڑبڑائیں۔

''آج رات تو فی الحال آپ چچا سے بات کریں۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔'' وہ پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑنے لگیں۔ ''ماں باپ کیوں مر گئے اس کے یہ ہی مر گیا ہوتا۔ نامراد کون سا سکے ڈھال رہا ہے سونے کے یا اس کے بغیر دنیا کے کام

رُکے ہوئے ہیں۔'' نیک نامی کی عمارت انھیں لرزتی دکھائی دے رہی تھی۔ ''اس سے تو کچھ بعید بھی نہیں۔'' وہ کوسنوں پر اتر آئی تھیں۔

اسی دم رشید صاحب اندر چلے آئے۔ بیوی کی شکن آلود پیشانی دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔

''بھئی کام ذرا زیادہ تھا، بتایا تو تھا تمھیں۔'' وہ سمجھے کہ وہ ان کے دیر سے آنے پر خفا بیٹھی ہیں۔''

''اجی! میری بلا سے ساری رات نہ آئیں آپ۔''

''اوہو! ہو، آج تو واقعی کوئی گڑبڑ ہے۔'' انھوں نے کوٹ اتارتے ہوئے تشویش کا اظہار کیا۔

''اب بھتیجے کو پانے سے بہتر تھا آپ مجھ پر سوتن لے آتے۔ ٹھیکہ نہیں لیا میں نے ساری عمر کا، غضب خدا کا۔ نہ بات کرنے کی تمیز نہ ادب منہ کے آگے خندق ہے، جو منہ میں آتا ہے بک دیتا ہے۔ بس آپ کہہ دیجیے اسے، چلا جائے یہاں سے وہ۔ ورنہ میں کچھ کھا کر سو رہوں گی۔'' ان کی آواز بھرا گئی۔

رشید صاحب کو ایک دم وقت کی سنجیدگی و سنگینی کا احساس ہوا۔ وہ بیوی کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

''سعدیہ! بھئی آخر بات کیا ہوئی؟''

''میں برسوں سے کہہ رہی ہوں، یہ لڑکا نیم پاگل ہے۔ اس کا علاج کرائیں، مگر آپ نے میری بات پر کبھی توجہ نہیں دی۔'' وہ الٹ پڑیں۔

''خدا نہ کرے سعدیہ! وہ کیوں پاگل ہونے لگا۔ احساسِ محرومی کی وجہ سے ضدی ہو گیا ہے اور ضد کا علاج محبت ہے۔ تم کبھی محبت سے.....''

''اجی بس کریں۔ خوب صلہ ملا ہے اسے رکھنے پالنے کا۔ ارے میں نے کون سا اس پر ظلم کیے ہیں۔ اس پر سے ہاتھی گزارے ہیں۔ بجلی کے شاک لگائے ہیں۔'' وہ شوہر کی بات کاٹ کر مزید تپ کر گویا ہوئیں۔

''ہونہہ، احساس محرومی۔ تیس ماؤں کی محبت ایک طرف آپ ایک طرف۔ اب بھی احساسِ محرومی۔ آپ کے سامنے بنا رہتا ہے گھنا۔ آنے والے سالوں میں اگر ہم میں سے ایک ایک کو پاگل بنا کر نہ چھوڑ دیا تو نام بدل دیجیے گا میرا۔ کس قدر اذیت و کوفت

دینے والی حرکتیں اور عادتیں ہیں اس کی۔''

''یہ تو تم بہت عرصے سے کہہ رہی ہو مگر بتاؤ اب ہوا کیا ہے؟'' وہ تھکے ہوئے لہجے میں گویا ہوئے۔

تب انھوں نے حرف بہ حرف گوش گزار کر دیا۔

''غلطی تمہاری ہی ہے سعدیہ! تم نے تابندہ کا رشتہ مانگنے سے فوراً انکار کیوں کر دیا۔''

''جی وہ تو مجھے پتا ہی تھا غلطی میری ہی نکلے گی۔ آپ سے زیادہ جانتے ہیں آپ کے پڑوسی، آپ اس گھر کی چھت تلے چھ گھنٹے گزارتے ہیں۔ ان سے چوبیس گھنٹوں کا ساتھ ہے۔ خوب واقف ہیں اس کی حرکتوں سے، بدتمیزیوں سے.....''

''ایک تو میری سمجھ میں نہیں آتا تم اس کی کون سی بدتمیزیوں اور بے وقوفیوں کا تذکرہ کرتی رہتی ہو۔ ہر وقت تو وہ مصروف رہتا ہے۔''

''ارے خدا معلوم کس پر گیا ہے آپ کے سامنے تو کمرے سے ہی نہیں نکلتا۔ مکار۔''

''بہرحال میں خود تابندہ کے والد سے بات کر لوں گا۔''

''خدا کے واسطے رشید صاحب! کیوں اس کی خاطر خود کو خاک کرتے ہیں۔''

''میں تمھیں تو کوئی تکلیف نہیں دے رہا۔ بس اب تم خاموش ہو جاؤ۔'' وہ خوب جانتی تھیں کہ وہ بھتیجے کی محبت میں ایک لفظ نہ سنیں گے۔

''ارے، ہئے کسی کی بچی کی آہ لگ گئی تو.....؟ رشید صاحب! خدا آپ کو سمجھ دے۔'' وہ زبردستی سونے کی کوشش کرنے لگیں۔

انھوں نے سوچ لیا۔ وہ اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں کریں گی۔ ان پر تو پہلے ہی دکھوں کے پہاڑ ٹوٹے ہوئے تھے۔

زمانہ برسرِ آزار تھا، مگر فانیؔ!
تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو

رشید صاحب! کو دیکھ کر تابندہ کے پپا وحید صاحب کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ عید تہوار پر ہی وہ تفصیلی ملا کرتے تھے۔ انھوں نے پُرتپاک انداز میں خیر مقدم کیا۔ تابندہ کی امی کو بھی بلا لیا۔ وہ بھی حیران تھیں۔ سرِ شام انھیں اپنے گھر میں دیکھ کر سعدیہ بیگم زبردستی

مسکرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''دیکھیے بھابی! آج ہم نے اپنی غرض کے لیے آپ کے ہاں حاضری دی ہے۔ آپ اور ہم گزشتہ بیس بائیس سال سے ایک ساتھ ہیں۔ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔'' رشید صاحب نے رسمی گفتگو کے بعد اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے میدان ہموار کیا۔

''جی، حکم کیجیے۔ یقین کیجیے اگر ہمارے اختیار میں ہوا تو؟''

''سب کچھ آپ کے اختیار میں ہے بھابی! فی الوقت تو سب ہی کچھ۔''

''آپ تو اشتیاق بڑھا رہی ہیں بھابی! آپ ہی کچھ بتایے۔ رشید صاحب تو پہیلیوں میں باتیں کر رہے ہیں۔'' تابندہ کی امی نے بے تابی سے کہا۔

''ہم تابندہ کو اپنی بیٹی بنانا چاہتے ہیں۔'' اصولاً سعدیہ بیگم ہی کو لب کشائی کرنا پڑی۔

''مگر عرفان کی تو منگنی۔'' تابندہ کی امی حیران ہوئیں۔

''عرفان کے علاوہ ہمارا ایک اور بیٹا بھی ہے احسن۔'' رشید صاحب نے جلدی سے کہا۔

تابندہ کی امی نے چونک کر دونوں میاں بیوی کو باری باری دیکھا، پھر شوہر کو دیکھنے لگیں۔

''مگر..... آپ تو کہتی تھیں کہ وہ ذہنی لحاظ سے۔'' وہ حیران تھیں کہ کل تک تو سعدیہ بیگم ان کے پاس اس کے دکھڑے رو کر جاتی تھیں آج اس کے لیے دستِ سوال لیے بیٹھی ہیں۔

''ارے نہیں! وہ دراصل ضدی بہت تھا نا بچپن میں بس جھنجلا کر غصے میں.....''

انھوں نے شوہر کو دیکھ کر زبردستی مسکرا کر بات بنائی مبادا رشید صاحب کا دل مزید بُرا نہ ہو کہ ان کے لاڈلے بھتیجے کی، کتھائیں پڑوسیوں کو بھی سنائی جاتی رہی ہیں۔

''پھر بھی..... اب دیکھیے نا اور بھی لوگوں نے کہہ رکھا ہے اور پھر تابندہ کی رضا مندی بھی تو بے حد ضروری ہے نا۔ اب ایک ہی تو بیٹی ہے ہماری۔''

''ارے بھابی! بالکل آپ تابندہ سے ضرور اس کی رضا مندی لیجیے مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ نے ہم پر اعتماد کیا۔ تو انشاء اللہ آپ کا اعتماد اسی طرح قائم رہے گا۔ میں آپ کو جوابدہ ہوں۔ بھائی ہوں آپ کا۔''

''ہوں! ویسے تو بولنا محال ہوتا ہے بھتیجے کے لیے۔ آج کہیں سے ادھار لائے ہیں یہ زبان۔ بس نہیں چل رہا لڑکی اٹھا کر لے جائیں اور بھتیجے کے حضور پیش کر دیں۔'' سعدیہ بیگم کو شوہر کی یہ عاجزانہ ادا ایک آنکھ نہ بھائی۔

''اچھا خیر، ہم سوچ کر جوابدیں گے نا۔ اب شادی بیاہ کا معاملہ ہے، برا نہ مانیے گا۔ آپ رشتے داروں سے بڑھ کر ہیں، ہمارے نزدیک۔ دس پندرہ دن بعد انشاء اللہ آپ کو جواب دے دیں گے۔ جیسا بھی ہوا، ہمارے آپ کے فیصلے تو کھیل تماشا ہیں، جو بچوں کے نصیب میں ہوگا انھیں وہی ملے گا۔''

تابندہ کی امی بے حد سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ بڑی وضع سے انھوں نے اپنی بات ختم کی۔

''خدا کرے میرا مان رہ جائے۔'' رشید صاحب نے سادگی سے کہا پھر سب چائے وغیرہ میں مشغول ہو گئے۔

یہ تو نہیں کہ تم سا جہاں میں حسیں نہیں
اس دل کو کیا کروں، یہ بہلتا کہیں نہیں

بلو آئی ہوئی تھیں۔ اڑتی اڑتی ان تک پہنچ گئی تھی۔ اپنی امی اور شالی کے سامنے استہزائیہ انداز میں ہنس کر بولیں۔

''امی! وہ نانی جان کسی حیران کن بات پر کہا کرتی ہیں نا کہ سبحان تیری قدرت، سبحان تیرے کھی۔ چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل۔''

اپنی بات کے اختتام پر انھوں نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ ''کہاں تابندہ، کہاں احسن بھائی، ارے امی! شکر کیجیے تابندہ کی امی بڑی لحاظ والی ہیں کوئی اور ہوتا تو یہی کہتا کہ یہ منہ، بلکہ احسن بھائی کے حساب سے یوں کہتا۔ ''وہ منہ اور مسور کی دال۔''

''ارے چھوڑیں اپیا! جب انھیں اپنی پسند مل جائے گی تو ٹھیک ہو جائیں گے۔ نہیں ہوں گے تو وہ ٹھیک کر دے گی۔'' شالی نے ہمیشہ کی طرح احسن بھائی کی حمایت میں کلمات ادا کیے۔

''اسے اور پاپا کو تو انھوں نے کچھ گھول کر پلا رکھا ہے۔ بدمزاجی کی کوئی حد ہے نہ انتہا۔ بچپن سے پٹ پٹ کر اُلو بن جاتی تھی ان کے ہاتھوں۔ کوئی غیرت مند ہوتا تو شکل

دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا۔" بلو نے بہن کو ورغلایا مگر وہ وہاں سے اٹھ ہی گئی۔

اسے اسلام آباد گئے ہوئے پندرہ روز ہو چکے تھے۔

آج وہ لوگ جواب سننے جا رہے تھے۔ سعدیہ بیگم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ کیا جواب ملے گا۔

مگر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب تابندہ کے والد نے اثبات میں جواب دیا۔

دوبارہ تابندہ کی امی نے دُہرایا۔ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھیں۔ ان کی بیٹی نے تین چار طلب گاروں میں سے احسن کو چنا تھا۔ انھوں نے بیٹی کو سمجھا بجھا کر دوبارہ اس سے پوچھا تو اس نے سر جھکا کر کہہ دیا۔ "امی! ان سب سے اچھے احسن ہیں۔" وہ خاموش ہو گئیں۔

تابندہ کا وہاں بہت آنا جانا تھا۔ اگر اس نے احسن کی کوئی مشکوک حرکت دیکھی ہوتی تو وہ ایسا کبھی نہ کرتی۔ وہ سمجھ دار لڑکی تھی مگر جانے کیوں انھیں دل سے خوشی نہ ہوئی تھی۔ آخر سعدیہ بیگم کو چڑھایا ہوا زہر تھا۔

بہرحال منہ میٹھا کرایا گیا۔ ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ شالی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

وہ رات گیارہ بجے کراچی واپس آیا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے تک اسے بذریعہ شالی خوش خبری موصول ہو چکی تھی۔ احسن کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا کہ وہ اتنی آسانی سے میدان جیت چکا ہے۔ شالی نے چچا کی کوششوں کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ وہ دل سے چچا کا ممنون تھا اور یہ خبر سن کر وہ رات بھر نہ سو سکا تھا۔ ایک خواب سا معلوم ہو رہا تھا۔

تجھے عشق دل سے کام تھا نہ کہ استخواں کا پھونکنا
فقط ایک شہر کے واسطے تو نے نیستاں کو جلا دیا

رخصتی کے بعد جب حجلۂ عروسی میں تابندہ کا میک اپ ٹھیک کرتے ہوئے شالی نے پوچھا۔

"تابی! کیا ادا بھائی تمھیں احسن بھائی کی؟" تب وہ نظریں جھکا کر خاموش ہو رہی۔

"کیا بتاؤں شالی! اسی بیڈ روم کی کہانی ہے۔ آج بھی وہ بھاری آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔ تابندہ جاؤ کہیں اور جا کر سو جاؤ۔ خواہ مخواہ افسانے بن جاتے ہیں۔" اس نے سر جھکا کر سوچا۔

وہ افسانہ بن کر آج اسی بیڈ روم میں تھی۔ آج اُسے کوئی یہاں سے بے دخل نہیں کر سکتا تھا۔ "وہ" بھی نہیں۔

اس نے رات دو بجے تک اس کا انتظار کیا تھا مگر پھر نیند سے ہار گئی تھی مگر صبح پانچ بجے اس کی خود بخود آنکھ کھل گئی تھی۔ وسیع و عریض بیڈ کے دوسرے سرے پر وہ کروٹ کے بل محوِ خواب تھا۔ اسے حیا سی آ گئی۔ ملال الگ ہوا کہ وہ کیوں سو گئی تھی وہ کیا سوچتا ہوگا۔

وہ اٹھی بڑی آہستگی سے، بڑی خاموشی سے زیورات اتارنے لگی۔ خوبصورت جوڑا کھولا۔ وارڈ روب سے شلوار قمیص نکالی اور باتھ روم میں چلی گئی۔ بازو پر عروسی جوڑا لٹکائے باہر آئی تو وہ خوابیدہ آنکھوں سے ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ اسے ٹوٹ کر حیا آئی۔ قدم من من بھر کے ہو گئے۔

"صبح بخیر۔" اس کی بھاری خوبصورت آواز کمرے کا سکوت توڑ گئی۔

وہ وہیں جم کر رہ گئی۔

"تاب! ادھر آؤ پلیز۔" اس کا یہ لہجہ قطعی اجنبی تھا۔ وہ جھجکتی ہوئی آگے بڑھ آئی۔

"ادھر آؤ، پلیز، ادھر میرے پاس۔" وہ نرمی سے گویا ہوا۔

وہ مزید آگے بڑھ آئی۔ احسن نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے کپڑے لے لیے۔

"سونے کی بہت رسیا ہو؟ چلو خیر، یہ بھی اچھا ہوا۔ جی بھر کر رات تمھیں دیکھا۔ اتنا کہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بہت ساری تصاویر بنائی ہیں تمھاری۔" اس نے پیچھے کھسک کر اس کے لیے جگہ بنائی اور آرام سے بٹھایا اور اس کی انگلی میں ایک خوبصورت انگوٹھی ڈال دی۔

"ایک حقیر سا تحفہ۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرایا۔

وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھی رہی۔ نیند لے لینے سے حسن اور دلکش ہو گیا تھا۔ احسن نے ہاتھ بڑھا کر سگریٹ کیس اٹھایا اور ایک سگریٹ نکال کر منہ میں دبائی، سگریٹ کیس واپس رکھ کر سگریٹ سلگائی۔

"خوش تو ہو نا تاب؟ کچھ بولو تو سہی۔ سچی بات تو یہ ہے اگر تمھارے گھر والے انکار کر دیتے تو تمھیں کسی نہ کسی طرح اڑا لے جاتا، کسی قیمت پر تمھیں نہ چھوڑتا۔ خیر اچھا ہی ہوا کہ گھی سیدھی انگلی سے نکل گیا۔"

"اُف۔" تابندہ کے منہ سے بے ساختہ کراہ نکلی تھی۔ تڑپ کر رہ گئی تھی وہ۔

''اوہ، معاف کرنا۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بازو پر سگریٹ کا گول نشان بن گیا تھا، آستین جل گئی تھی۔ اس جگہ سے تکلیف کی شدت سے تابندہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''اُف، یہ کیسے ہو گیا۔ ٹھہرو، میں کچھ لگاتا ہوں۔'' وہ شرمندہ سا تھا۔ جانے کہاں سے کوئی ٹیوب نکال کر لایا اور بڑی آہستگی سے زخم پر مرہم لگایا۔ تابندہ کی آنکھوں سے آنسو لڑھک کر رخساروں پر آ ٹکے تھے۔

''ویری سوری تاب! تمھارے جلوؤں نے اس قدر بے گانہ کر دیا کہ بس۔ آؤ، اچھا لیٹ جاؤ آرام کرو۔ ابھی تو سب ہی سو رہے ہیں۔''

وہ جلے ہوئے بازو کی تکلیف ضبط کرتی ہوئی دوسری طرف آ کر ٹک گئی۔ جلن اس قدر شدید تھی کہ ہر خوبصورت تصور محو ہو چکا تھا اور نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ اپنی اس انیس سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ اس کے جسم کو جلنے کا احساس ہوا تھا۔ اتنے نازوں سے پالی گئی تھی پھر وہ سلیقہ مند بھی تھی۔ ہر کام میں احتیاط کرتی تھی۔ جلن کی شدت اتنی تھی، چین نہیں پڑ رہا تھا، کسی طرح بھی۔

''کیا بہت تکلیف ہو رہی ہے، جان؟''

اس کے آنسو نکل پڑے۔ ''اس ٹیوب سے بھی جلن میں کمی نہیں ہوئی۔'' وہ بمشکل گویا ہوئی۔

تب وہ اٹھ گیا۔ سامنے دراز میں جانے کیا دیکھتا رہا۔ پھر اس کی طرف پلٹا۔ سائڈ سے جگ اٹھا کر گلاس بھرا اور ایک ننھی سی گولی اس کی ہتھیلی پر رکھی۔

''یہ گولی کھا لو تاب! نیند آ جائے گی۔''

اس نے گولی پانی سے نگل لی۔ یہ پوچھے بغیر کہ جلن میں کمی کی گولی ہے یا نیند کی؟

تھوڑی دیر بعد وہ اردگرد کے ماحول سے غافل ہو چکی تھی۔

وہ دوسری جانب کہنیوں کے سہارے اونچا ہو کر اس کا چہرہ بغور دیکھ رہا تھا۔ رخساروں پر آنسوؤں کے نشان ثبت ہو گئے تھے۔

محبت، اِک تپشِ ناتمام ہوتی ہے
نہ صبح ہوتی ہے اس کی نہ شام ہوتی ہے

اس نے باہر آ کر شالی سے کہہ دیا۔ ''گیارہ بجے سے پہلے تابندہ کو نہ اٹھانا اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

شالی پریشان ہو گئی۔ ''کیا ہوا احسن بھائی؟''

''ارے بھئی، ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اب تم ہر جگہ شور مچاتی نہ پھرنا۔''

وہ گیارہ بجے جب سو کر نہ اٹھی تو بھگدڑ مچ گئی۔

اسے باقاعدہ ہلا ہلا کر جگایا۔ وہ بمشکل اٹھی مگر بیٹھ کر بھی جھوم رہی تھی۔

''کیا ہوا تابندہ؟'' احسن کی رشتے کی پھوپھی نے اس کا رخسار تھپتھپایا۔ ''بیٹی! کیا بات ہے؟''

اس نے پلکیں اٹھا کر جم غفیر کی طرف دیکھا۔

''کچھ نہیں، بس نیند آ رہی ہے ایسے ہی۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''لو احسن بھائی تو اچھے خاصے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ تم، یہ تمھارے حصے میں اتنی نیند کہاں سے آ گئی۔'' بلو شرارت سے ہنسی۔

''ارے وہ مرد ہیں، ان کے اعصاب مضبوط ہیں۔'' ان کی کزن ہنسیں۔

''یہی تو حیرانی کا مقام ہے، ان کے اعصاب تو غیر معمولی طور پر کمزور ہیں۔ ذرا سی بات برداشت نہیں ہوتی۔''

تب تابندہ کو احساس ہوا وہ اس طرح جھوم جھوم کر ان لوگوں کو پریشانی میں مبتلا کر رہی ہے۔ تب اس نے خود کو سنبھالا۔

بلو، شالی اس کے ہمراہ ناشتا کر رہی تھیں۔

''بھئی تمھارے شوہر تو آٹھ بجے ناشتا کرنے کے عادی ہیں۔ یہ ہم ہی جاں نثار ہیں جو تمھارے اٹھنے کا انتظار کر رہے تھے۔''

''ارے شرماؤ نہیں، یہ وہی گھر ہے جہاں تم بے تکلفی سے آتی جاتی رہی ہو۔ ٹھیک سے کھاؤ، لو یہ مونگ کی دال کا حلوہ لو۔ امی نے خاص طور پر دلہن کے لیے بنایا ہے۔''

دل کو تم سے بڑی عقیدت تھی
آج حیران ہو گیا ہے دل

وہ ولیمے کے بعد گھر آئی ہوئی تھی۔ امی نے بتایا۔ احسن کا فون آیا ہوا ہے۔ وہ

خوش گوار دھڑکنوں پر قابو پاتی فون تک آئی۔

''ہیلو!''

''جی، میں تابندہ بول رہی ہوں۔''

''کیا حال ہیں جناب کے؟'' ادھر سے شوخی سے پوچھا گیا۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے شرگیں مسکراہٹ سے جواب دیا۔

''صرف ٹھیک، اچھا سنو، ایک ضروری بات کرنی ہے تم سے۔''

''جی۔''

''سنو، تم اپنی امی کے ہاں ہی رہو۔''

''جی؟ کیا مطلب؟''

''پوری بات تو سنو۔ دراصل میں نے اپنا ٹرانسفر اسلام آباد کرا لیا تھا میں یہاں رہنا نہیں چاہتا۔ میں یہاں اب رہ بھی نہیں سکتا۔ کافی سامان آج میں اپنے دوست کے ہمراہ بھجوا رہا ہوں۔ پرسوں ہم لوگ یعنی میں اور تم روانہ ہو جائیں گے۔ تم گھر میں بتا دو۔''

''لیکن اس طرح اچانک؟'' اس نے کچھ پوچھنا چاہا۔

''اچانک نہیں ہے زندگی۔ سب کچھ پروگرام کے تحت ہے۔ بس تم وہیں رہنا۔''

''نہیں آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ضرور۔''

''کیا گھر والوں سے ناراضگی.....؟'' وہ بات پوری نہ کر سکی۔

''تاب! تم میری بیوی ہو، شریک حیات ہو۔ تم سے کچھ چھپ سکتا ہے بھلا۔ ہاں تاب! اس گھر سے میری ناراضگی برسوں کی نہیں بلکہ پیدائشی ہے۔ صرف تمھیں حاصل کرنے کے لیے میں نے اپنی طبیعت کے خلاف بہت کچھ سہا ہے۔ میں فلائٹ سے ایک گھنٹے پہلے آ کر تمھیں لے جاؤں گا۔'' اس نے ریسیور رکھ دیا۔

وہ ریسیور تھامے ساکت کھڑی رہ گئی۔ اس کی شادی روایتی شادی تھی۔ کیا اس اقدام سے لوگ باتیں نہ بنائیں گے اور پھر سب سے بڑھ کر میرے گھر والے کیا سوچیں گے۔ میں آپ کو کیسے کہوں احسن بعض اوقات اپنی ذات کو الگ رکھ کر بھی کچھ کرنا پڑتا ہے۔

امی نے اس کی توقع کے عین مطابق ردعمل کا اظہار کیا۔ ''دماغ تو ٹھیک ہے

احسن کا۔ آخر وہ تمہاری سسرال ہے۔ رشتہ مانگنے آئے۔ بیاہنے آئے۔ یہ بڑی غلط حرکت ہے۔ تم مل کر جانا اور ان لوگوں نے یہ ٹرانسفر وغیرہ کی بات تو بتائی نہیں تھی۔''

''امی! ٹرانسفر وغیرہ تو ملازمت کے دوران ہوتے ہی رہتے ہیں۔'' اس نے بات رکھنا چاہی۔

انھوں نے بیٹی کی صورت دیکھی اور انھوں نے جان لیا۔ احسن کے خلاف کوئی بات کر کے وہ اپنی بات ہی کھوئیں گی۔

مگر جب وہ اسے لینے آیا تو امی نے منا ہی لیا کہ وہ اسے سب سے ملا کر لے جائے۔ خدا معلوم وہ کس طرح راضی ہو گیا۔ وہ بھی چچا کی وجہ سے۔

چچی جان نے بڑی خندہ پیشانی سے دلہن کے سلام کا جواب دیا۔ چچا گھر پر نہیں تھا۔ وہ شالی اور چچی سے مل کر آ گئے۔ محض دس منٹ کے لیے۔ اس کا دل تو بہت بُرا ہو رہا تھا۔ سب سے جدا ہوتے ہوئے، مگر وہ حقیقت تسلیم کر چکی تھی کہ اب تو جہاں وہ رہے گا اسے بھی وہیں رہنا ہوگا۔

اسلام آباد آ کر شدت سے تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ وہ تو صبح آٹھ بجے آفس چلا جاتا تھا۔ وہ شروع شروع میں تو بہت مصروف رہی۔

اس روز وہ کچن میں تھی۔ احسن نے چائے کے لیے کہا تھا۔ وہ چائے بنا کر خواب گاہ میں آئی تو وہ بڑی تندہی سے کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ اس کی آمد پر بھی سر نہیں اٹھایا۔ اس نے سائڈ ٹیبل پر چائے کا کپ رکھ دیا۔ وہ باہر آئی ہی تھی کہ کال بیل بج اٹھی۔ اس نے دروازہ کھولا ابھی تک کسی ملازم کا بندوبست نہیں ہو سکا تھا۔ اسے تمام کام خود ہی کرنا پڑ رہے تھے۔ پتا چلا کہ احسن کے کولیگز آئے ہیں۔ وہ اسے بتانے دوبارہ خواب گاہ میں آئی۔ ایسا معلوم ہوا گویا اسے اس وقت آنے والوں کی مداخلت ناگوار گزری ہو۔ ناچار اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس کا خیال تھا وہ آفس ورک کر رہا تھا وہ کاغذ ترتیب سے رکھنے لگی تو رائٹنگ پیڈ پر نگاہ پڑتے ہی چونک گئی۔ وہ خط میں چچی جان سے مخاطب تھا۔

چچی جان محترمہ!

اسلام علیکم

آج ہمیں اسلام آباد آئے ہوئے پورا ایک ہفتہ ہو گیا۔ تابندہ ٹھیک ہے سارا دن

کسی نہ کسی کام میں لگی رہتی ہے۔ میں اپنے انتخاب پر خوش ہوں۔ میرا بے حد خیال رکھتی ہے۔ آج کل تو گھر سجانے میں لگی ہوئی ہے۔ بہت خوبصورت گھر سیٹ کیا ہے۔ آپ حیران ہوتی ہوں گی۔ میں اس طرح اچانک اسلام آباد کیوں چلا آیا ہوں۔ چچی جان! میری طبیعت بہت خوددار ہے۔ اس سے قبل بھی آپکا رویہ بے حد شان دار رہا، مگر آپ نے مجھے کبھی گھر چھوڑنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ یاد کیجیے جب میں نے تابندہ سے متعلق آپ سے بات کی تھی، اس وقت آپ نے مجھے خدا کا واسطہ دے کر گھر چھوڑنے کا حکم دیا تھا۔ یقین کیجیے، ہر چیز پر لعنت بھیج کر اسی وقت نکل جانے کو جی چاہا تھا مگر صرف تابندہ کو حاصل کرنے کے لیے اس روز میں نے خود پر جبر کیا تھا۔ اگر اس روز میں گھر چھوڑ دیتا تو شاید تاحیات تابندہ کو حاصل نہ کر پاتا۔ میں نے زندگی میں کبھی کسی چیز کی آرزو نہیں کی تھی۔ ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ہاں مگر ایک آرزو تابندہ کی کی تھی۔ میں اپنے رب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ویسے مجھے چچا کی پرخلوص کوشش کے بارے میں شالی نے بتایا تھا۔ انھیں میرا سلام و پیار۔ چچا جان کو کسی روز فون کرلوں گا۔ انھیں بھی سلام دیجیے گا۔

آپ کا نیم پاگل

احسن معید

دوسرا خط کسی دوست کے نام تھا۔ اس نے جلدی سے سب کاغذ تکیے پر رکھ دیے اور باہر آ گئی۔ گویا اس نے صحیح سمجھا تھا۔ احسن نے ہی اس کے لیے کہا تھا۔ پہلے یہ گمان بھی ہوتا تھا کہ شاید رشید چچا نے اپنے طور پر خوشی سے اس کا انگ انگ گنگنا اٹھا۔ کوئی اس عورت کی خوشی کیا پوچھے جس کا شوہر اس کا جم جم دیوانہ نہ ہو، مگر اسے خط میں ایک بات سخت بری لگی تھی، آپ کا نیم پاگل۔'' ہونہہ پاگل ہوں ان کے دشمن۔'' وہ سرشار سی اپنے کاموں میں مصروف ہوگئی تھی۔

کبھی حیات کی ضامن کبھی وسیلۂ مرگ
نگاہِ دوست ترا کوئی اعتبار نہیں

اس روز وہ بے انتہا تھک گئی تھی۔ کچن بند کر کے وہ خواب گاہ میں آئی۔ رات کا کھانا وہ آٹھ بجے تک کھا لیتے تھے۔ وہ کمرے میں آئی تو احسن کچھ پڑھ رہا تھا۔

''احسن! مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔ آپ ٹیبل لیمپ جلالیں میں ٹیوب بند کر رہی ہوں۔''

''اتنی جلدی بھئی۔''

''بس بہت تھک گئی ہوں۔ آج تو بہت نیند آ رہی ہے۔'' وہ لباس تبدیل کرنے باتھ روم میں جاتی ہوئی گویا ہوئی۔

''مگر کل تو جمعہ ہے۔''

''مجھے تو پتا ہے، مگر نیند کو نہیں معلوم۔'' وہ تھکن کی وجہ سے اس کی خوبصورت بات سے حظ نہ اٹھا سکی۔ بڑا سرد سا جواب دیا۔

اور آسمانی فرل لگی نائیٹی میں ملبوس بستر پر گر گئی۔

وہ دوبارہ کتاب میں گم ہو چکا تھا۔

گہری نیند میں اسے لگا جیسے اس کے بائیں بازو میں انگارہ اتر گیا ہو۔ اس کی نیند ایک دم ٹوٹ گئی۔

''اوہ! میرے خدا!'' وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

احسن نے ایک دم کتاب الٹ دی۔ اس کی انگلیوں میں سلگتا ہوا سگریٹ تھا۔

''کیا ہوا؟''

''آپ کو پتا نہیں کیا ہوا؟'' وہ جلے ہوئے حصے کو انگلیوں میں دبا کر رو پڑی۔

''ارے میں کتاب میں اتنا گم تھا کہ.....''

''بس جھوٹ نہ بولیں۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''یقین کرو، مجھے پتا.....''

''رہنے دیں، اتنی دور تھی میں آپ سے۔'' اس کے آنسو سلسلہ وار بہہ رہے تھے۔

''تمھیں یقین نہیں آئے گا، وہ ٹیوب کہاں ہے۔''

''میں خود لگا لوں گی۔'' وہ خفگی سے بولی اور اٹھ کر لائٹ جلا کر ٹیوب نکالنے لگی۔

ٹیوب لگا کر آنسو پونچھے۔ وہ اٹھ کر اس کے نزدیک چلا آیا۔

''کوئی معذرت بھی نہیں سنو گی؟''

اس نے آنکھیں رگڑ کر خفگی سے اسے دیکھا۔ سفید شلوار قمیص میں ملبوس اس کا مضبوط سراپا بے حد شان دار نظر آ رہا تھا۔ گھنی مونچھوں تلے اس کے لب معذرتی انداز میں مسکرا رہے تھے، مگر وہ منہ موڑ کر بیڈ پر چلی آئی اور چادر تان کر لیٹ گئی۔ جلن کی شدت کی

وجہ سے نیند بھی اڑ گئی تھی۔ خواہ مخواہ رونا آ رہا تھا۔

ٹیوب بند کرنے کے لیے احسن نے بٹن دبایا۔ اس نے آواز سنی۔ اس کے بعد وہ بیڈ پر واپس آیا۔ لیمپ بند کیا اور شاید فوراً ہی سو گیا تھا۔

کچھ اس ادا سے یار نے پوچھا مرا مزاج
کہنا پڑا کہ شکر ہے پروردگار کا

وہ اس سے پورے دو دن خفا رہی۔ اس کے منانے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی مگر تیسرے دن احسن کو سخت فلو ہو گیا۔ تب اسے دوستی کرنی پڑی اور کون تھا گھر میں جو اس کی دیکھ بھال کرتا۔

''تاب! اتنی شدت سے خفا نہ ہوا کرو۔'' وہ اس کے لیے کافی بنا کر لائی تو وہ بہت یاسیت سے گویا ہوا۔

''آپ نے میرا بازو دو مرتبہ جلایا ہے۔ پتا ہے کتنی جلن ہوتی ہے۔'' وہ شاکی لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

تب اس نے اس کی آستین اوپر کی دودھیا بازو پر ننھا سا سرخ نشان تھا۔

''کیا واقعی تم سمجھ رہی ہو کہ میں نے جان بوجھ کر تمہارا بازو جلایا ہے؟''

''تو اور کیا۔''

''یقین کرو بے خبری میں۔''

''یہ خوب بے خبری ہے۔ کسی کی جان پر بن جائے بلا سے۔'' اس نے ناز سے کہا۔

''اس دن بھی جلا دیا تھا۔'' وہ مزید گویا ہوئی۔

''کس دن؟'' اس نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''مجھے نہیں پتا۔'' وہ شرما گئی اور بہانے سے کمرے سے نکل گئی۔

کچھ خیال نہیں رہتا کچھ دھیان نہیں رہتا
انسان محبت میں انسان نہیں رہتا

تابندہ کئی روز سے دیکھ رہی تھی۔ جب وہ ایکسرسائز کرنے لان میں جاتی تو ایک خاتون پڑوس کے لان میں کھڑی ہو کر پُرشوق نگاہوں سے دیکھا کرتیں۔ اسے وہ بہت اچھی لگیں۔ اس دن وہ ایکسرسائز کا پروگرام ملتوی کر کے باڑ کے پاس جا کھڑی ہوئی اور

خوبصورت انداز میں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔ آپ لوگ نئے آئے ہیں غالباً۔ ارے یہیں کھڑے ہو کر آپ سے باتیں کرنے لگی۔ آیئے اندر آیئے نا۔'' تب وہ ان کے پیچھے ہو لی۔

خاتون خانہ اسے ڈرائنگ روم میں لے آئیں۔

''آیئے تشریف رکھیے۔ میں اپنے میاں سے کہہ رہی تھی کہ ہمارے پڑوس میں ایک بہت کیوٹ سی لڑکی آئی ہے۔'' خاتون نے پُراشتیاق نظریں اس پر دوڑائیں۔

وہ شرما سی گئی۔

''کہاں سے آئے ہیں آپ لوگ؟''

''کراچی سے۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''کون کون ہے آپ کی فیملی میں۔ میرا مطلب ہے بہن بھائی، والدین یعنی ہمارے پڑوس میں رہنے والوں کی تعداد۔'' وہ ہنسیں۔

''جی، فی الوقت تو صرف میں اور میرے میاں ہیں یہاں۔'' اس نے بتایا۔

''ارے ماشاء اللہ شادی شدہ ہو، بالکل نہیں لگتیں۔ کب ہوئی شادی؟''

''گزشتہ ماہ کی تین تاریخ کو۔''

''ارے بالکل نئی دلہن ہو۔ کیا سسرال والوں نے آتے ہی نکال دیا تھا؟''

''نہیں، بس میرے میاں کا یہاں ٹرانسفر ہو گیا۔''

''ارے بھئی، بالکل نئی دلہن ہو، کچھ سج بن کر رہا کرو۔ اتنی سادہ تو غیر شادی شدہ لڑکیاں بھی نہیں رہتیں۔ تمہارے میاں بھی نہیں کہتے۔ خیر انھیں آج کل ہوش کہاں ہوگا۔'' خاتون بے حد بے تکلف تھیں۔ اسے اچھی لگیں۔

''لو بھلا ہمارا یہ حال ہو گیا تمھیں دیکھ کر کہ نہ تمہارا نام پوچھا نہ تمہارے میاں کا نہ اپنا بتایا نہ اپنے میاں کا نہ بچوں کا۔''

''جی میرا نام تابندہ ہے۔ میرے شوہر کا نام احسن معید۔''

''اور بھئی تابندہ! مجھے نادرہ کہتے ہیں۔ میرے شوہر ڈاکٹر معین صدیقی سائیکالوجسٹ بھی ہیں۔ تین بچے ہیں میرے۔ ایک بیٹی روبینہ، دو بیٹے عاطف اور واصف۔ دیکھو بھئی، اب ہماری تمہاری دوستی پکی ہے۔ بلا جھجک بتاؤ۔ چائے، کافی یا کولڈ ڈرنک۔''

انھوں نے جھٹ بات کا پہلو بدل دیا۔

''جو آپ کی مرضی۔'' اسے کہنا پڑا۔

''وہ جو گرے کرولا میں روزانہ آٹھ بجے نکلتے ہیں اگر وہی تمہارے شوہر ہیں تو بلاشبہ مور اور مورنی کی جوڑی ہے، چشم بددور۔'' وہ پہلی ملاقات ہی میں اتنی بے تکلف اور محبت سے بول رہی تھیں کہ تابندہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور ان کی طرف سے خوبصورت تاثر لیے ہوئے چلی آئی بلکہ بہت مسرور تھی کہ وقت تو خوش گوار گزرے گا، ان کی رفاقت میں۔

شام کو احسن آئے تو سب سے پہلی خبر اس نے یہی سنائی۔

''اگر تمھارے لیے یہ بات خوشی کی ہے تو بھلا اس سے بڑھ کر میرے لیے کیا خوشی ہوسکتی ہے۔'' اس نے تابندہ کے خوبصورت چہرے پر والہانہ نظر ڈال کر خوش دلی سے کہا۔

''اچھا سنیں، آج ہمیں کہیں لے کر چلیں۔'' وہ ناز سے بولی۔

''کہاں؟'' وہ جاتے جاتے پلٹ آیا۔

''کہیں بھی، اب میں یہاں کی جگہوں سے تو واقف نہیں ہوں نا۔ بس دل چاہ رہا ہے کہیں گھومنے پھرنے کا۔''

''اپنی پڑوسن کے ہمراہ چلی جانا نا۔'' اس نے چھیڑا۔

''جی نہیں، اگر مجھے جانا ہوتا کسی کے بھی ساتھ تو اتنے دن ہو گئے ہیں یہاں آئے ہوئے، میں آپ کے ساتھ گھومنا چاہتی تھی یہاں۔'' اس نے خفگی سے کہا۔ ''آپ کے ساتھ۔''

''پاگل کر دو گی مجھے بھئی، اتنی محبت نہ جتایا کرو۔'' وہ اس کے نزدیک آ کر بڑے وارفتہ انداز میں بولا۔ ''بھئی مجھے خود بھی احساس ہے، فکر نہ کرو، خوب گھماؤں گا۔'' احسن نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

اس نے بھی اس کی مجبوری جان کر ضد نہ کی۔

''اور ہاں تابندہ! وہ جو اوپر کمرہ ہے نا، میری تمام پینٹنگ وہاں سیٹ کر دینا۔ ایزل وغیرہ بھی تمام کلرز، برش وغیرہ۔ آئی ول بی تھینک فل ٹو یو مائی سوئٹی۔ کبھی کبھار اچانک ''آمد'' ہوتی ہے۔ میں نے ایک دو افراد سے ملازم یا ملازمہ کے لیے کہہ رکھا ہے۔ تم بھی

اپنی نئی پڑوسن سے کہہ دینا۔ ہوسکتا ہے ان کے ذریعے ہی کام بن جائے۔ تمھیں بھی آرام مل جائے گا۔''

وہ جلدی کھانا کھا کر دوبارہ چلا گیا۔ وہ پھر بور ہونے لگی۔ وقت گزارنے کے لیے بڑے سے صندوق سے اس کی پینٹنگز نکال کر صاف کرنے لگی۔ بڑی خوبصورت تصاویر تھیں جو اس نے پہلے بھی دیکھی ہوئی تھیں۔ اس دلہن کی تصویر بھی تھی جس کے بارے میں احسن نے انکشاف کیا تھا کہ اس کا بایاں رخسار سگریٹ سے جھلسا ہوا ہے۔ تصویر پر نظر پڑتے ہی اس دن کے تمام واقعات اس کی نظروں کے سامنے گردان کرنے لگے۔ اسے ایک دم خوف سا محسوس ہونے لگا۔ دل میں محبت کا ہر تاثر ختم ہو کر خوف و ڈر قدم جمانے لگا۔ بازو پر لگے ہوئے سگریٹ کے داغ از سر نو دہکنے لگے۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا اس کا جسم سگریٹ سے داغ دیا گیا ہو۔ وجود کا ہر حصہ اسے گھر کے در و دیوار سے خوف محسوس ہونے لگا۔ وہ باہر گیٹ کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ایک دم کراچی شدت سے یاد آنے لگا۔ ایک ایک کر کے تمام لوگ ان کے ساتھ، ان کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے، ماہ و سال۔ خواہ مخواہ ہی آنسو بہنے لگے۔ وہ جانے کب تک اسی طرح بیٹھی رہی تھی۔ کار کی ہیڈ لائٹس اس کے چہرے پر پڑیں۔ احسن نے کار وہیں روک لی اور حیران و پریشان سا گاڑی سے اتر آیا تھا۔

''تاب جان! یہاں کیوں بیٹھ گئیں آ کر؟'' وہ پاس آ کر اسے شانوں سے تھام کر اٹھاتے ہوئے حیرانی سے بولا۔ وہ بے آواز رو پڑی۔ وہ بے طرح پریشان ہوا تھا۔

''کیوں؟ کیا ہوا ہے؟ خدارا بتاؤ نا۔'' وہ اسے اندر لے آیا۔

وہ بُری طرح سسک پڑی۔

''احسن! آج آپ ایک وعدہ کریں۔ ورنہ میں اندر نہیں جاؤں گی، یہیں کھڑی رہوں گی۔'' وہ بسوری۔

''ہاں، ہاں بولو۔'' وہ بے تابی سے گویا ہوا۔

''آپ آج سے کبھی سگریٹ نہیں پئیں گے۔'' وہ برابر رُو رہی تھی۔

''کیوں کیا محکمۂ صحت والے آئے تھے۔'' اس نے مذاق کیا۔

''مذاق نہیں کریں، وعدہ کریں۔'' وہ خفگی سے گویا ہوئی۔

''دیکھو پچھلے ماہ کی تین تاریخ سے اب تک تم سے اتنے عہد و پیمان کر چکا ہوں کہ کسی جمہوری ملک کے صدر نے سالوں میں نہیں کیے ہوں گے۔ ابھی بھی وعدہ؟''

''احسن! میں سپریس ہوں، ورنہ مجھے کراچی بھیج دیں۔ مجھے آپ سے، میرا مطلب ہے آپ کی سگریٹ سے ڈر لگنے لگا ہے۔''

''تاب!'' وہ اسے اندر لے جاتا ہوا گویا ہوا ''تمھیں کیسے یقین دلاؤں کہ بابا میں نے دانستہ تمہارا باز نہیں جلایا۔ خدارا معاف کر دو یار۔ اب دیکھو نا سگریٹ ایک دم تو نہیں چھوڑی جا سکتی، البتہ کم ضرور کی جا سکتی ہے۔ چلو یہ وعدہ کہ گھر میں زیادہ نہیں پیوں گا، اتنی رعایت تو دو گی ناں۔''

پرسش غم آپ رہنے دیجیے
یہ تماشا ہے مرا دیکھا ہوا

آج اس پر ایک اور حیرت کا پہاڑ ٹوٹا تھا۔ وہ کچن میں جلے ہوئے کاغذ دیکھا کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا احسن سگریٹ جلانے کے لیے کاغذ وغیرہ جلا لیتے ہیں لیکن آج چھٹی کے روز وہ تولیے سے ہاتھ پونچھتی تیزی سے کچن میں آئی تھی اور ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔

احسن کاغذ کی پتی بنائے جلا کر بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک پورا کاغذ جل گیا تھا۔ اس نے دوسرا ٹکڑا اٹھا کر موڑا اور آگ کے نزدیک لے گیا پھر جلتے ہوئے کاغذ کو بغور دیکھنے لگا۔ یہ ٹکڑا بھی بھڑ بھڑ جل کر ختم ہو گیا۔ وہ تیزی سے احسن کے سامنے آ گئی۔

''یہ آپ کاغذ کیوں جلا رہے ہیں؟'' اس نے تعجب سے احسن کو دیکھا۔

احسن نے نظریں اٹھا کر تابندہ کو دیکھا۔ تابندہ کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ جانے کیا تھا اس کی آنکھوں میں۔

''کیا ہو گیا ہے آپ کو؟'' وہ خوف زدہ انداز میں بولی۔

وہ جیسے ایک دم ہوش میں آ گیا، ہنس کر بولا۔ ''ارے ایسے ہی فالتو کھڑا تھا، بس یونہی غیر ارادی سی حرکت تھی۔''

مگر تابندہ کے ذہن میں گرہ سی پڑ گئی۔ اسی دن دوپہر کو جب وہ آلو چھیل رہی

تھی، احسن پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ آلو چھیل کر مٹر چھیلنے لگی۔ احسن نے ایک آلو اٹھایا اور چاقو سے گودنا شروع کر دیا۔ آلو کا کچومر نکال دیا۔

''اللہ، یہ آپ نے کیا کیا؟'' اس نے شاکی انداز میں یہ کہہ کر چاقو اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اس سے پیش تر وہ مزید غور و خوض کرتی۔ نادرہ بھابی اپنے شوہر کے ہمراہ آ گئیں۔ گھر میں رونق سی ہو گئی۔

نادرہ کے شوہر بھی بہت دلچسپ انسان تھے۔ احسن بھی ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ وہ رات کے کھانے پر دونوں کو منانے آئے تھے۔ انھوں نے بہت انکار کیا مگر ان کے سامنے ایک نہ چلی ناچار انھوں نے دعوت قبول کر لی۔

دعوت بہت خوش گوار رہی۔ اس کا ذہن بھی ہلکا پھلکا ہو گیا۔ بہت خوش خوش نظر آ رہی تھی۔

نادرہ کے بچے بھی بہت شرارتی تھے۔ ان کی باتوں میں وقت کا پتا ہی نہ چلا۔ تقریباً رات کے ایک بجے وہ گھر واپس آئے تھے۔

زندگی بڑی تیزی سے گزرنے لگی تھی۔ اسے یہاں آئے تیسرا مہینہ تھا۔ اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ نادرہ بھابی اس کا بہت دل بہلایا کرتیں۔ دونوں گھروں میں بے حد بے تکلفی ہو گئی تھی۔ اس نے احسن کو کبھی دوستوں میں خوش گپیاں لگاتے نہیں دیکھا تھا مگر معین بھائی کی شفقت کے سامنے وہ بھی بے بس تھا۔

ان تین مہینوں میں اس نے احسن کے ہزاروں رنگ دیکھے تھے۔ محبت کے رنگ، سرد مہری کے رنگ، خفگی کے رنگ، خوشی کے رنگ، دکھوں کے رنگ، اس نے پل پل تابندہ کو حیران کیا تھا لیکن اس کی چاہت کا رنگ ہر رنگ پر حاوی تھا۔ اس لیے اس نے بھی بڑے پیار سے سمجھوتے کر لیے تھے۔

اس نے اس کے جنون کے رنگ شادی سے پہلے بھی دیکھے تھے مگر اس کی اس بات نے اس کے دل کو شکست دے دی تھی۔ اتنے لوگوں کے ہوتے ہوئے صرف وہی اس کے خیالوں میں آ بسا تھا۔ شادی کے بعد معلوم ہوا کہ اسے محبت کرنا آتی ہے اور تابندہ کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی کہ وہ اس کائنات کی محبت پرست عورت تھی۔ ایک روز اس نے

ڈرتے ڈرتے پوچھ بھی لیا تھا۔

''احسن چچی جان، بلو، شالی کے ساتھ آپ کے انداز کچھ اور ہوتے تھے بلکہ ہر ملنے والے سے، بہت تنہائی پسند تھے لیکن یہاں تو آپ بہت بدلے ہوئے نظر آتے ہیں، آپ تو بہت محبت کرنے والے ہیں۔''

''ارے کہاں محبت کرنے والا ہوں، قرض چکاتا ہوں تمھاری محبت کے۔'' اس نے گویا انکساری برتی۔

اور وہ بڑے ناز سے مسکرا دی۔

.....✿.....

غم موجود ہے آنسو بھی ہیں کھا تو رہا ہوں پی تو رہا ہوں
جینا اور کسے کہتے ہیں اچھا خاصا جی تو رہا ہوں

اس کی طبیعت بہت گری گری رہنے لگی تھی۔ وہ خاموشی سے لیٹی ہوئی تھی۔

''تاب! دیکھو میں اُوپر ہوں۔ کام کر رہا ہوں۔ کوئی آئے مجھے ڈسٹرب نہ کرنا اور ایک کپ اچھی سی کافی بنا لانا۔''

''اچھا۔'' اس نے کاہلی سے جواب دیا۔ وہ اسی طرح پہلو کے بل لیٹی رہی، پھر ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگی۔ کتاب پڑھتے پڑھتے اسے کافی دیر ہوگئی تو وہ کافی بنانے کے لیے اٹھ گئی اور دوپٹہ اوڑھتے ہوئے کچن میں چلی آئی۔

کافی بنائی، بڑے پیار سے سجائی اور مسکراتی ہوئی اُوپر آئی۔ انگوٹھی سے دروازہ بجایا۔ نچلا ہونٹ دبا کر آہستہ سے کہا۔

''احسن!''

''ہوں، آ جاؤ۔'' اس کی مصروف سی آواز آئی۔

وہ اندر چلی آئی۔ وہ بڑی تیزی سے کینوس پر برش چلا رہا تھا۔ بے حد خوبصورت پینٹنگ تھی۔

''احسن! آپ کی پینٹنگز مکمل ہو جائیں تو دیکھیے گا ایگزیبیشن کا اہتمام ضرور کراؤں گی، کراچی میں۔''

''ارے نہیں بھئی، یہ تو یونہی فضول سا شوق ہے۔ بس دل کا غبار نکالنے کا بہانہ۔''

اس کے ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ شب خوابی کے ریشمی قیمتی لباس میں وہ معروف معروف سا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس کا ہیئر اسٹائل بہت نفیس تھا۔ شادی سے پہلے بھی وہ اس کے ہیئر اسٹائل سے متاثر تھی۔ اب تو اس نے اپنی موی انگلیوں سے کئی بار اس کا ہیئر اسٹائل بگاڑ ڈالا تھا۔ کبھی پیار سے، کبھی خفگی سے، کبھی شرارت سے۔ اس نے نظریں ہٹا دیں اور کافی کا مگ تپائی پر رکھ کر تصاویر ٹھیک کرنے لگی۔

معاً وہ خوف زدہ سی ہوگئی۔ جھلسے ہوئے رخسار والی دلہن کی تصویر بڑے اہتمام سے سجی ہوئی تھی۔ اسکے برابر میں ایک اور تصویر تھی۔ ایک آدمی سڑک پر گرا ہوا تھا۔ تمام سڑک خون سے بھری ہوئی تھی۔ اس کے برابر میں ایک آدمی کی تصویر تھی جو درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا تھا۔ اس کے سینے میں ایک تیر ترازو تھا اور اس مقام سے خون ٹپک ٹپک کر پاؤں بھگو رہا تھا۔ وہ ایک دم احسن کی طرف پلٹ گئی۔ وہ کافی پیتے ہوئے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے پلٹے دیکھ کر مسکرایا۔

''تاب!''

''جی۔'' اس نے احسن کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی بے رحم سی مسکراہٹ تھی۔

''تاب! زخم بازو پر ہوں تو چھپ جاتے ہیں۔ پتا ہی نہیں چلتا اور اگر رخسار پر ہوں تو صاف نظر آتے ہیں۔''

''تاب! ادھر میرے پاس آؤ۔''

تابندہ کو ایک دم خوف محسوس ہونے لگا۔ وہ پیچھے ہٹنے لگی۔

''زندگی! یہاں آؤ، سچ ایک بہت ضروری بات ہے۔ سنو گی نہیں؟'' احسن کا لہجہ بدل گیا تھا۔ وہ تابندہ کے نزدیک آ گیا۔ ''تاب! تم میری شریک حیات ہو۔ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ تاب! مجھے پاگل ہونے سے بچا لو۔''

''جی۔'' وہ کانپ کر بولی۔

''تاب! مجھے پاگل ہونے سے بچا لو۔ دیکھو صرف ایک داغ۔ تمھارے رخسار پر۔''

''احسن!'' وہ خوف سے مرنے کو ہوگئی۔

''تاب! صرف ایک داغ، صرف ایک داغ، احسان کر دو مجھ پر۔''

''نہیں احسن نہیں، خدارا کیا ہو گیا آپ کو۔''

وہ دہشت زدہ ہو کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''احسن! مجھ پر تیل چھڑک دیجیے۔ میرے وجود کو مکمل جھلسا دیجیے احسن! میں مر جاؤں گی۔ آپ کو کیا ہو گیا۔'' وہ بے بسی سے چیخ چیخ کر رونے لگی۔

''تاب! میں پاگل ہو جاؤں گا۔ زندگی! مجھے اذیت سے نکال دو۔ میرے ذہن سے یہ سب انگارے جھاڑ دو۔'' اس کی آواز بدل گئی تھی، لہجہ بدل گیا تھا۔

''تاب!'' اس نے اس کی ٹھوڑی انگلیوں سے چھو کر چہرہ اونچا کیا۔ وہ بے بسی سے پھڑپھڑانے لگی پھر اس کے حلق سے ایک کرب ناک چیخ بلند ہوئی تھی۔

احسن نے جھک کر منہ میں دبی ہوئی سگریٹ اس کے رخسار پر ٹکا دی تھی۔ وہ گرتی پڑتی زینے سے اتر کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی اور قالین پر گر گئی۔ ہچکیوں سے اس کا پورا وجود ہل رہا تھا۔ رو رو کر وہ پاگل ہو رہی تھی۔ ہر مرہم، دوا سے بے نیاز وہ بس روئے جا رہی تھی۔ اتنا روئی کہ ساری عمر میں کبھی نہ روئی تھی۔ روتے روتے جانے کب آنکھ لگ گئی تھی۔ جب اٹھی تو سارے گھر پر دھوپ پھیل چکی تھی۔ احسن جا چکا تھا۔

اس نے آئینہ دیکھا۔ رو رو کر آنکھیں پھوڑا ہو رہی تھیں۔ ایک چھالا اس کے رخسار پر اُبھر آیا۔ شکل سے بدشکل ہو رہی تھی۔ اپنی بے بسی کا احساس کر کے اس کی آنکھیں پھر بھر آئیں۔

''احسن آپ کو کیا ہو گیا تھا۔ میں آپ سے کبھی بات نہیں کروں گی۔ میں آج ہی کراچی چلی جاؤں گی۔''

''تابندہ! تابندہ.....! ارے بھئی کہاں ہو؟ چلو بھئی گیارہ بج رہے ہیں۔ میں بازار جا رہی ہوں۔ تمہارا چیک اپ بھی کرا دوں گی ڈاکٹر خالدہ سے۔''

نادرہ بھابی اس تک پہنچتے پہنچتے اپنی بات مکمل کر چکی تھیں۔ وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

''اور ہاں! ایک خوش خبری ہے تمہارے لیے۔ ملازمہ مل گئی ہے۔ بہت اچھی،

ار..... رے..... یہ..... یہ تمہارے گال پر کیا ہوا؟'' آدھی بات ان کے منہ میں ہی رہ گئی۔

تابندہ نے پلکیں جھکا لیں۔ ایک ہمدرد کو سامنے پا کر اس سے مزید ضبط نہ ہوا۔ وہ ان کے سینے سے ٹک کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

نادرہ بھابی کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ''ارے، تابی، تابندہ! میری بہن کیا ہوا؟''

''بھابی! میں جا رہی ہوں کراچی۔ احسن کی چچی ٹھیک کہتی تھیں۔ اگر میں کچھ دن اور رہی نا تو اذیت ناک موت مر جاؤں گی۔''

''ارے، خدا نہ کرے۔'' وہ مزید پریشان ہو گئیں۔ اُسے بٹھایا، پانی پلایا۔

''بات کیا ہے؟ کچھ بتاؤ تو سہی؟''

تب اس نے انھیں سب کچھ بتا دیا۔ بازو کے نشانات بھی دکھائے۔ بھابی کا دل تڑپ کر رہ گیا۔

''کیا شروع سے ہی..... ان چیزوں کا، باتوں کا اظہار نہیں ہوا تھا جو تمہارے والدین نے.....''

''نہیں بھابی! ہم لوگ تو انھیں شروع سے جانتے ہیں۔ بچپن میں تو سب ان کی باتوں کو ضد اور خودسری پر محمول کرتے تھے۔ ان کے والدین بھی نہیں ہیں۔ اپنے چچا کے ہاں رہتے تھے۔ سب سمجھتے تھے شاید اسی وجہ سے، یعنی وہ احساس محرومی کا شکار ہیں۔ ان کی چچی کا رویہ بھی ان کے ساتھ ٹھیک نہیں تھا۔''

''تابی! ایک طرح سے ان کا رویہ تمہارے ساتھ اشتعال اور اذیت پسندی کا مظہر ہے۔ میں معین سے بات کروں گی۔ انھوں نے تو بہت سے پیچیدہ کیسز حل کیے ہیں۔''

''بے کار ہے بھابی! احسن کبھی رضا مند نہیں ہوں گے۔ وہ سمجھتے ہیں وہ بالکل نارمل ہیں، انھیں کوئی بیماری نہیں، کوئی احساس کمتری، برتری اور محرومی نہیں۔''

''تم فکر نہ کرو، ہمت نہ ہارو۔ تم اس کی بیوی ہو۔ اس کی بھلائی کے لیے آگے بڑھو۔ اچھا فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ارے اس دنیا میں جو نہ ہو کم ہے۔ اب گھبرانا مت تو پھر چل رہی ہو یا نہیں۔''

''نہیں بھابی، میں اس حال اور اس حلیے میں کہیں جاتی اچھی لگوں گی؟''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔ اگر تم نے بازار سے کچھ منگوانا ہو تو بتا دو۔'' انھوں نے پوچھا۔

''فی الوقت تو کچھ یاد نہیں آ رہا۔''

''اچھا پھر میں چلتی ہوں۔ خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔''

قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حیات
اس زیاں خانے میں ترا امتحان ہے زندگی

نادرہ نے اپنے شوہر کو بہت سراسیمگی اور عجلت میں تمام بات بتائی تھی۔

''سچ معین! میرا تو شاپنگ میں بھی دل نہیں لگا۔ اتنی پیاری، نازک سی لڑکی، اس پر کم عمر اور ناتجربہ کار ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو، خدانخواستہ۔''

''اتنے دن ہو گئے ہیں تمہاری دوستی کو، بتا آج رہی ہو۔''

''بھئی مجھے کیا پتا تھا۔ وہ تو بالکل نارمل نظر آتے ہیں، دیکھا، نہیں آپ نے؟ بس ذرا کچھ کم گو اور تنہائی پسند سے لگتے تھے۔ توبہ کتنی صابر لڑکی ہے۔ سچ کبھی بھی اس نے مجھے نہیں بتایا۔ بس آپ کسی طرح معلوم کریں کہ احسن بھائی ایسا کیوں کرتے ہیں۔ سمجھانے کا معاملہ ہے تو سمجھائیں اگر علاج وغیرہ ضروری ہے تو وہ کریں، مگر معین مجھے تو یہ نفسیاتی کیس ہی لگتا ہے۔ اتنی چاہت سے بیاہ کر لائے ہیں، اتنی محبت کرتے ہیں، ویسے ہر طرح اس کا خیال رکھتے ہیں مگر دیکھیں تو سہی۔''

''فکر نہ کرو، میں دیکھوں گا۔ تابندہ کو بھی سمجھانا کہ گھبرائے نہیں۔'' انھوں نے مخصوص حلیم انداز میں کہا۔

پھر اسی روز شام کو دونوں چلے آئے تھے۔ وہ آفس سے آ چکا تھا۔ تابندہ کچن میں تھی۔ نادرہ اسے بھی وہاں سے لے گئیں۔ احسن اور معین باتوں میں مصروف تھے۔

معین بھائی تابندہ کی طرف دیکھ کر بولے۔

''یار! یہ کوئی پتھر کا مجسمہ نہیں۔ تم کبھی اپنے وجود کے کسی حصے پر سگریٹ داغ کر دیکھو۔''

اس نے تابندہ کی طرف دیکھا۔

''بھئی، انھیں نہ گھورو۔ انھوں نے شکایت نہیں کی ہے بلکہ ہم نے یہ جلا ہوا نشان

دیکھ کر معلوم کیا تھا تو انھیں بتانا پڑا۔'' معین جلدی سے بولے۔

''آپ لوگ بہت فارغ رہتے ہیں یا پھر دوسروں کے معاملات میں مداخلت کا کچھ زیادہ شوق ہے؟'' وہ پل میں اجنبی بن گیا۔ عجیب توہین آمیز انداز تھا۔ نادرہ تو منہ کھول کر ہونق ہو گئیں۔ مگر معین اسی طرح تحمل سے بیٹھے رہے۔

''جو ایذا تم نے تابندہ کو دی ہیں تم جانتے ہو کہ یہ مجرمانہ فعل ہے۔ اس پر سزا بھی ہو سکتی ہے۔'' وہ اس طرح بولے گویا احسن ننھا بچہ ہو۔

وہ ماتھے پر سینکڑوں بل ڈالے بہت ضبط سے بیٹھا رہا۔ تابندہ کے اس رویے پر بہت خجالت محسوس کر رہی تھی۔

معین نے نادرہ اور تابندہ کو اشارہ کیا کہ وہ باہر چلی جائیں۔

وہ باہر برآمدے میں آ گئیں اور دوسری باتوں میں لگ گئیں مگر تابندہ کا ذہن خواب گاہ ہی میں اٹکا ہوا تھا جہاں معین اور احسن بیٹھے ہوئے تھے۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ دونوں حیرت سے منہ کھول کر رہ گئیں جب معین احسن کا ہاتھ تھامے باہر آئے اور بولے۔

''ذرا ہم ابھی آتے ہیں۔ آؤٹنگ پر جا رہے ہیں تاکہ احسن کا موڈ خوش گوارہ ہو جائے۔ اس کی بہت ضرورت ہے۔''

ان دونوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ان دونوں کو جاتا دیکھتی رہیں۔

بھابی تھوڑی دیر بعد چلی گئی تھیں یہ کہہ کر ملازمہ صبح پہنچ جائے گی۔

رات بارہ بجے قریب احسن نے دروازے پر دستک دی تھی۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھولا مگر بولی کچھ نہیں۔ وہ بھی خاموشی سے خواب گاہ میں چلا گیا۔

کیوں دیکھ رہے ہو مری افسردہ نگاہی

صبح وہ کاموں میں لگی ہوئی تھی کہ نادرہ کی ملازمہ پیغام لے کر آ گئی کہ بی بی کہہ رہی ہیں سب کام چھوڑ کر آ جائیں۔ احسن تو آٹھ بجے سے پیش تر ہی جا چکے تھے۔ وہ دوپٹہ ٹھیک کر کے دروازہ لاک کر کے گھبرائی ہوئی نادرہ کے ہاں چلی آئی۔

''خیریت بھابی؟'' وہ حیرانی سے بولی۔

''ہاں، میرے میاں نے یاد فرمایا ہے۔'' وہ مسکرائیں۔

''معین بھائی نے۔ وہ کیوں؟'' وہ مزید حیرانی سے بولی۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر اندر آ گئیں۔

''السلام علیکم معین بھائی!''

''وعلیکم السلام آؤ بھئی۔ دراصل میں نے تمھیں اس لیے بلایا ہے کہ میں رات کو احسن کو لے کر اپنے کلینک چلا گیا تھا۔ وہ واقعی ذہنی مریض ہے۔''

''جی۔'' تابندہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

''گھبراؤ نہیں، ایک ماہ میں وہ بالکل نارمل ہو جائے گا۔ اسلام آباد میں اس کا آنا بہت مبارک ثابت ہوا۔ ورنہ شاید تمام زندگی یونہی گزر جاتی۔ لو دیکھو، سنو کیونکہ تمھیں بھی جاننا چاہیے کہ تم اس کی بیوی ہو تحلیل نفسی کے دوران اس نے جو مجھے جواب دیے، سنو۔''

انھوں نے ٹیپ ریکارڈ آن کیا۔

معین بھائی کی آواز اُبھری۔ پھر احسن کی بھاری آواز، جیسے وہ بہت دُور سے بول رہا ہو۔ تابندہ دم بخود بیٹھی سنتی رہی۔ معین کے ہر سوال کا جواب وہ بہت تفصیل سے دے رہا تھا۔ تابندہ نے ساکت ہو کر ایک ایک لفظ سنا۔

سوالات و جوابات کا سلسلہ ختم ہوا تو معین نے ٹیپ آف کر دیا۔

اس نے بتایا کہ اس کے والد سخت غصیلے انسان تھے۔ اس کی ماں کا تعلق ایک غریب خاندان سے تھا۔ اس کے والد اشتعال میں آ کر اکثر زد و کوب و مغلظات پر اتر آتے تھے۔

اس نے اپنی ماں کو بارہا تنہائیوں میں سسکتا دیکھا تھا۔ والد سب کے لیے ہی آمر تھے۔ ماں کی مظلومیت اور اس کی خاموشی کے سبب احسن کی تمام ہمدردیاں ماں کے ساتھ تھیں۔ بارہا احسن کو بھی معمولی شرارتوں پر سخت جسمانی ایذائیں دی جاتی تھیں۔

احسن نے بتایا کہ ایک رات جب وہ جاگ رہا تھا، اس نے ماں کی چیخ سنی۔ وہ سمجھ گیا کہ آج پھر کسی معمولی بات پر ماں کو سزا مل رہی ہے۔ وہ بھاگ کر باہر آیا۔ اس نے خواب گاہ میں جھانکا اس کے والد کے تشدد کے سبب اس کی ماں کے منہ سے خون بہہ رہا

تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی کسی چیز سے ماں کو زد و کوب کرنا شروع کر دیا۔ جس وقت وہ زخمی ماں پر حملہ آور تھے اس وقت احسن کا جی چاہا تھا کہ وہ باپ کے ہاتھ سے وہ چیز جو شاید گلدان تھا، چھین لے اور باپ کو سخت سزا دے۔ ماں کو بچا لے، مگر باپ کے خوف سے وہ کچھ نہ کر سکا تھا۔ بس اس گھڑی کے بعد اس کے ذہن میں ایک گرہ سی پڑ گئی۔ پھر اس کا جی چاہنے لگا۔ وہ ایک ایک چیز کو توڑ ڈالے۔ آگ لگا دے۔

اور آج بھی وہ کبھی کبھی اس جنونیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اسے یہ معلوم ہے یہ درست نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہ خود کو کنٹرول نہیں کر پاتا۔ دوسروں کو ایذائیں پہنچا کر اسے روحانی تسکین ملتی ہے۔ ماں کے مرنے کے بعد تو اس کی کیفیت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا کیونکہ اس کی ماں ٹی بی کی مریضہ ہو کر مری تھی جس کے لیے وہ اپنے باپ کو قصور وار سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔

معین نے تحلیل نفسی کے دوران پوچھا تھا۔

''کیا تم اس ذہنی عذاب سے چھٹکارا پانا نہیں چاہتے؟'' تب اس نے جواب دیا تھا کہ وہ یہ سب نہیں کرنا چاہتا ہے مگر سرزد ہو جاتا ہے اور وہ دل سے اس عذاب سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے۔

تابندہ نے بڑے غور سے سب کچھ سنا۔ اس کا دل ہمدردی سے لبریز ہو گیا۔

''تابندہ! والدین اپنے غلط طرزِ عمل کے سبب بچوں کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیتے ہیں اور گھریلو بے سکونی بچوں کے لیے مشکلات پیدا کر دیتی ہے اور دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ ان سے زیادہ ان کے بچوں کو کوئی نہیں چاہ سکتا۔ تابندہ! یہ کیسی محبت ہے کہ ایک انسان اس طرح زندہ رہے کہ نہ خوشی محسوس کر سکے اور نہ راحت۔ اس کے ذہن میں جھکڑ چلتے رہیں اور دنیا اسے پاگل قرار دے کر اس پر مزید ظلم کرے۔ یہ ایک انسان پر زیادتی کی انتہا ہے۔ لوگ بچہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ ان کی معمولی سی غلطی بچے کی کامیابیوں کے دروازے بند کر سکتی ہے اور ان کی غلطیوں کے سبب بچہ حقیقی زندگی سے دور ہوتا جا رہا ہے۔''

معین بھائی بڑے جذب سے کہہ رہے تھے۔ تابندہ اور نادرہ خاموشی سے سن

رہی تھیں۔

محبت کو سمجھنا تو ناصح، خود محبت کر
کہ ساحل سے کبھی اندازۂ طوفان نہیں ہوتا

ایک ماہ اور گزر گیا تھا۔ کراچی سے فون اور خطوط کا سلسلہ جاری تھا، لوگ اسے یاد کر رہے تھے۔ اس نے بڑی تفصیل سے ماں کو خط لکھا تھا کہ وہ فی الحال نہیں آ سکتی۔ نہ احسن کو چھٹی مل سکتی ہے۔ اسے بڑے اچھے ہمسائے مل گئے ہیں جو اس کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔

احسن پر معین بھائی واقعی بہت محنت کر رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ احسن بالکل نارمل ہو چکا ہے اور اتنی جلدی نارمل ہونے کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ وہ خود کو ذہنی طور پر علاج کے لیے آمادہ کر چکا تھا۔ معالج کو مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب مریض خود کو صحت مند سمجھے اور علاج کرانے پر آمادہ نہ ہو اور آمادہ ہو بھی جائے تو دلچسپی نہ لے۔ تم بہت خوش نصیب ہو تابندہ! احسن فطرتاً بہت نیک دل اور سادہ ہے۔ بس تم اپنی محبتوں میں کمی نہ کرنا۔ وہ ہمیشہ تم سے گرم جوش محبت کی توقع رکھے گا۔" انھوں نے اسے نصیحت کی۔ وہ تہہ دل سے معین کی ممنون تھی جو اس کے لیے اس قدر خلوص سے کام کر رہے تھے۔

آپ کے لب اور وفا کی قسم
کیا قسم کھائی ہے خدا کی قسم

"تابندہ!"

"جی۔"

"دیکھو بھئی، آج جمعہ ہے اور ہم چھٹی منا رہے ہیں لہٰذا ناشتے وغیرہ کے لیے بالکل ڈسٹرب نہ کیا جائے۔"

"جی اچھا۔" وہ پلاسٹک کے بیگ سے خوبصورت چھوٹے چھوٹے کپڑے کے پیس نکال رہی تھی۔ اس کی طرف سے پیٹھ موڑے نیچے قالین پر بڑی بے نیازی سے بیٹھی تھی۔

"تابندہ!"

"جی؟"

"کیا کر رہی ہو؟"

"کچھ نہیں بس ایسے ہی۔" اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر مسکراہٹ دبائی۔

"تابندہ!"

"جی۔ ای۔" اس مرتبہ اس نے لمبا سانس لے کر احسن کو مڑ کر دیکھا۔

"وہ میرا سگریٹ کیس دینا۔"

وہ اٹھ کر کارنس پر سے سگریٹ کیس اور لائٹر اٹھا لائی اور اسے دے کر واپس پلٹنے لگی۔

"جا کہاں رہی ہو۔ ادھر آؤ، میرے پاس بیٹھو۔"

وہ بیٹھ گئی۔ سرخ کڑھائی کے سبز سوٹ میں گیلے بالوں کو بکھرائے اس کے دل میں اتر گئی۔

"ذرا وہ بازو دکھانا جو جلنے سے بچا ہوا ہے۔ لاؤ ذرا بیلنس کر دوں۔"

تابندہ نے بگڑ کر اس کی صورت دیکھی۔ وہ اس طرح دیکھ رہا تھا کہ اسے ٹوٹ کر حیا آ گئی۔ اس نے اپنا دودھیا بازو پیش کر دیا۔ احسن نے اس دلفریب ادا پر سارا دھواں اس پر چھوڑ دیا۔

مشہور و معروف ناول نگار و قلمکار

رفعت سراج

کا مقبول ناول

رشتوں کے ریشم

زیر طباعت ہے .....☆..... عنقریب شائع ہو رہا ہے

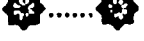

علم و عرفان پبلشرز

34-اردو بازار، لاہور فون: 7352332